Regd. L. No.7243

Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1972

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء

شہدائے پاکستان

اس انتظار میں ہیں کہ ہم ان کے خون کی

قیمت کب ادا کرتے ہیں۔

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ

ایک روپیہ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

بدل اشتراک

پاکستان

سالانہ ــــــ دس روپے

غیر ممالک

سالانہ ــــــ ایک پونڈ

جلد ۲۵ | ستمبر ۱۹۷۲ء | نمبر (۹)

فہرست

(۱) انتساب ۲

(۲) صدائے بازگشت ۳

(۳) لمعات ۴

(۴) طلوعِ اسلام کالج فنڈ (سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) ۱۶

(۵) قائد اعظم! — آپ کہاں ہیں؟ (محترم پرویز صاحب) ۱۸

(۶) حقائق و عبر ۴۵

(۷) مجلسِ مذاکرہ (۱) طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۲ء) ۴۹

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف، مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور

انتساب

(طلوع اسلام جنوری ۱۹۴۸ء)

محاذِ کشمیر کی داستان سادہ و رنگین بیان کرتے ہوئے، خان بابا حاجی گل نے کہا۔

بارہ مولا کے ہسپتال میں ایک زخمی مجاہد کو لائے۔ سولہ سترہ برس کا نوجوان۔ شاخِ طوبیٰ کی طرح بلند قامت چمکتی ہوئی پیشانی، دمکتا ہوا چہرہ، سرخ و سپید رنگت، آنکھوں میں حسنِ یوسف کی معصومیت نور افشاں۔ پلکوں کے جھکاؤ میں دامنِ مریم مروحہ جنباں۔ سر سے پا تک شباب بے داغ کا نورانی مجسمہ۔ زخموں کے فشار سے تمام سینہ لالہ زار۔ اور لہو کی رنگینی سے جیب و داماں پُر بہار۔

—آیا اور ہسپتال کی دیوار کے ساتھ پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ عزم و استقامت کا پیکر خاموش!

ڈاکٹر نے خونچکاں کرتہ، اٹھا کر دیکھا تو سینہ گولیوں سے چھلنی ہو رہا تھا۔ میں اور ڈاکٹر محو حیرت تھے کہ یہ اس وقت تک زندہ کیسے رہا؟

ڈاکٹر سامانِ جراحت کی فراہمی میں مصروف تھا۔ میں دیگر ضروریات کی تلاش میں مشغول۔ اور وہ زخمی شیر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بدستور خاموش!

اتنے میں باہر میدان میں کچھ شور سا اٹھا۔ ایک نعرہ بلند ہوا اور آواز آئی۔

غازیاں نوں فتح کے ژنئ — دخدائے نصرت تا سو سرہ دے

مجاہدو آگے بڑھو۔ خدا کی نصرت تمہارے ساتھ ہے۔

نوجوان سپاہی کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر کو اٹھیں۔ رائفل کا سہارا لے کر جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا، خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اور ان خون کے قطروں کے سوا جنہیں صحن ہسپتال کی خاک کے ذروں نے ابھر کر چوم لیا تھا، عزم و ایمان کی اس داستانِ خاموش کا کوئی نشان پیچھے نہ رہا۔

طلوع اسلام — اس مجاہد گمنام کے مقدس خون کے ان قطرات سے انتساب کا شرف حاصل کرتا ہے جن میں زندگی کی صحیح تفسیر جھلمل جھلمل کر رہی ہے اور جن کی ضیا پاش رنگینیاں اپنے ثبات و دوام سے اس حقیقت کبریٰ کا اعلان کر رہی ہیں کہ

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

صدائے بازگشت

ستمبر ۱۹۶۵ء کے زلزلہ انگیز دنوں کی بات ہے۔ میں دوپہر کے وقت اپنے کمرے میں بیٹھا کام میں مصروف تھا کہ اطلاع ملی کہ ایک فوجی نوجوان ملنے کے لئے آیا ہے۔

چند لمحوں میں میرے سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ گرد و غبار سے اٹی ہوئی خاکی وردی۔ کیچڑ میں لتھڑے ہوئے بوٹ۔ بکھرے ہوئے بال۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی۔ متوسط قامت۔ اکہرا بدن۔ زرد سے چہرے پر بچپن کے بھولے پن اور شباب کے ولولوں کا حسین امتزاج۔ لیکن آنکھوں میں بجلی کی سی چمک۔ کہنے لگا کہ سیدھا محاذ سے آرہا ہوں۔ میں نے کہا کہ عزیزم! یہ تو تمہاری صورت ہی سے عیاں ہے۔

کہا کہ ابا جان طلوع اسلام پڑھتے ہیں۔ ہمارے گھر میں قرآن کریم کا چرچا رہتا ہے۔ دو تین دن ہوئے ان کا خط آیا تھا کہ اگر تھوڑی سی بھی فرصت مل جائے تو پرویز صاحب سے ضرور ملنا اور کہنا کہ وہ تمہارے لئے دعا کریں۔ مجھے آج ایک محاذ سے دوسرے محاذ کی طرف جانے کے سلسلہ میں ادھر سے گذرنا تھا۔ گھنٹہ بھر کی فرصت تھی۔ میں نے کہا کہ آپ کی دعائیں لیتا جاؤں۔

میں نے اس سے جنگ کے حالات پوچھنے شروع کئے۔ اس نے تھوڑی دیر تک باتیں کیں اور پھر اجازت مانگی۔ میں اٹھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تو اس نے کہا کہ آپ نے مجھے دعا تو دی نہیں۔ میں نے کہا کہ بیٹا! تمہیں کیا دعا دوں؟ اس نے کہا۔

میں دو محاذوں پر جا چکا ہوں اور دونوں سے زندہ واپس آ گیا ہوں۔ میں شوق شہادت سے تڑپ رہا ہوں۔ دعا کیجئے کہ اب کے محاذ میں مجھے شہادت نصیب ہو جائے۔

میں اس کے سامنے ساکت و صامت کھڑا تھا۔ مجھ میں ایک لفظ تک بولنے کی ہمت نہ تھی۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کا ماتھا چوما۔ اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے بمشکل اتنا کہہ سکا کہ

میرے عزیز! میری سو جانیں تم پر فدا ہوں۔ تم میری دعاؤں کے محتاج نہیں۔ میں تمہاری دعاؤں کا محتاج ہوں۔ یاد رہے تو محاذ پر میرے حق میں دعا کرنا۔

وہ پیچھے ہٹا۔ میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسے گرم جوشی سے دبایا۔ فوجی سلام کیا۔ اور آہستہ آہستہ، لیکن تنے ہوئے قدم اٹھاتا واپس چلا گیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ اسوقت تک میرے کانوں میں آرہی ہے اور پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

آشیاں جلتا رہا، ہم ناتواں دیکھا کئے!

مسلمانوں نے ہسپانیہ میں قریب آٹھ سو سال تک حکومت کی۔ حکومت بھی اس شان اور دبدبہ سے کی کہ سارے یورپ میں ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ ان کی شوکت وحشمت، دولت وثروت، قوت واقتدار تو ایک طرف، ان کے ذوقِ جمالیات کا یہ عالم تھا کہ ان کے دور کی عمارات میں سے جو دو ایک تعصب عیسائیت کے کدال سے بچ گئی ہیں، وہ ساری دنیا کے اربابِ نظر کا قبلۂ مقصود بنی ہوئی ہیں اور کوئی اہلِ ذوق ایسا نہیں جو انہیں دیکھ کر وجد میں نہ آجاتا ہو ـــ انہوں نے آٹھ سو سال تک اس ملک میں حکومت کی لیکن آج اس ملک میں، عام مسلمان تو ایک طرف ان کے سلاطین میں سے بھی کسی کی قبر کا نشان تک باقی نہیں۔ ہم جب تاریخ میں اس قوم، یا اسی جیسی اور اقوامِ سابقہ کی، پہلے اس قدر عروج، پھر زوال اور آخر الامر ہلاکت کی داستانیں پڑھتے تھے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ قومیں کسی اتفاقی حادثہ سے تو تباہ نہیں ہوئیں۔ یعنی ایسا نہیں ہوا کہ ایک برسرِ عروج قوم رات کو آرام اور اطمینان سے سوئی ہو، نصف شب کے قریب زلزلہ آیا ہو اور وہ ساری کی ساری قوم اس طرح زمین میں دھنس گئی ہو کانھم لم یکن شیئاً مذکوراً (گویا وہ کبھی کوئی قابلِ ذکر شے ہی نہیں تھی) اور اس کے بعد فقط اس کی داستانیں باقی رہ گئی ہوں۔ وہ قوم رفتہ رفتہ روبہ زوال ہوئی تھی۔ وہ بتدریج تباہی کے غاروں کی طرف بڑھتی گئی تھی، اور اس طرح آہستہ آہستہ ختم ہو گئی تھی۔ جو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی وہ یہ کہ جب وہ قوم آہستہ آہستہ تباہی کی طرف جا رہی تھی، یا یوں کہیے کہ جب تباہی کا سیلاب اس کی طرف امنڈے چلا آرہا تھا تو اس قوم کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ یہ سب کچھ خاموش بیٹھے دیکھتی رہی اور اس نے اس تباہی سے بچنے کے لئے کچھ بھی نہ کیا۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ یہ چیز ہمارے روزمرہ کے مشاہدہ کے خلاف تھی۔ ہم نے دیکھا (اور آپ نے بھی دیکھا ہوگا) کہ ایک شخص نہایت جذب وانہاک سے شطرنج کی بازی لگائے بیٹھا ہو ـــ اس جذب وانہاک کے ساتھ کہ اسے دنیا ومافیہا کی کچھ خبر نہ رہے لیکن اگر اس کے کان میں یہ آواز پڑ جائے کہ اس کے مکان کو آگ لگ گئی ہے تو وہ شطرنج، اس کی بساط اور اپنی جیتی ہوئی بازی، سب کچھ چھوڑ چھاڑ، ننگے پاؤں اٹھ بھاگے گا کہ اپنے گھر کو تباہ ہونے سے بچا لے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تباہ ہونے والی قوموں کو اپنے اماکن کے بچانے کا اتنا خیال بھی نہیں رہتا تھا جتنا خیال شطرنج کے اس کھلاڑی کو ہوتا ہے۔ یہ بات البتہ دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک پاگل کو اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے گھر کو جلنے سے بچا لے ـــ وہ تو الٹا خود ماچس جلا کر گھر میں پھینک دیتا اور اس کے جلنے کا تماشہ دیکھ کر قہقہے لگاتا ہے۔ لیکن ایک فرد تو پاگل ہو سکتا ہے

کیا ایک قوم بھی اس حد تک پاگل ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے گھروں کے جلنے کا تماشہ (قہقہے لگا کر نہ سہی) خاموش بیٹھی دیکھتی رہے۔ ایک پابندِ قفس پرندہ تو بصد حسرت و یاس یہ کہہ سکتا ہے کہ

آشیاں جلتا رہا، ہم ناتواں دیکھا کئے

لیکن کیا ایک آزاد قوم بھی اس مقام تک پہنچ سکتی ہے؟ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آیا کرتی تھی۔

لیکن یہ بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی جب سالِ گزشتہ 'دیکھتے ہی دیکھتے' مشرقی پاکستان ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا۔ مشرقی پاکستان کسی ہنگامے کی نذر نہیں ہو گیا۔ اسے کسی زلزلہ نے نگل نہیں لیا۔ کوئی سیلاب اچانک آکر اسے بہا نہیں لے گیا۔ اگر زیادہ دور پیچھے نہ بھی جایا جائے تو بھی کم از کم ۱۹۶۶ء سے اس کی تباہی کے آثار ہمارے سامنے آنے شروع ہو گئے تھے جب مجیب نے اپنے چھ نکات پیش کئے تھے۔ اس نے اس خطۂ پاکستان کی علیحدگی کی اسکیم کو طشت از بام کر دیا لیکن قوم شطرنج کی بازی میں بدستور منہمک رہی۔ اس نے بھارت کے ساتھ ساز باز شروع کر دی۔ سازش پکڑی گئی۔ اس پر مقدمہ چلا لیکن بجائے اس کے کہ اسے حوالۂ دار و رسن کیا جاتا، "بہی خواہانِ قوم" (یعنی نام نہاد لیڈرانِ کرام) نے انتہائی دباؤ ڈال کر اسے نہ صرف رہا کرایا بلکہ سب سے بڑا محبِ وطن اور بطلِ جلیل قرار دیا۔ اس نے وہاں اپنی پرائیویٹ آرمی تیار کر لی۔ اس نے انڈیا کی فوجیں بلا لیں۔ اس نے بغاوت کے سارے ساز و سامان مکمل کر لئے۔ وہ یہ سب کچھ کر رہا تھا اور قوم نہایت خاموشی سے بیٹھی محوِ تماشا تھی — قوم یہ سب کچھ، ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم، کے انداز سے دیکھتی رہی تا آنکہ (دیکھتے ہی دیکھتے) وہ ملک ہاتھوں سے نکل گیا۔

یہ سب کچھ ہمارے دیکھتے دیکھتے ہو گیا لیکن اس کے باوجود ہم (اہلِ مغربی پاکستان) نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ پاکستان کا وہ حصہ ہم سے ہزار میل دور تھا۔ ہم تک صحیح حالات نہیں پہنچ سکے اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ایسا کس طرح ہوا اور کیوں ہوا؟ (یہ تحقیقاتی کمیشن وغیرہ ہمارے اسی فریبِ نفس کے غماز اور اپنے آپ کو یہ جھوٹا اطمینان دلانے کے نفسیاتی حربے ہیں کہ اس تباہی کے لئے ہم (یعنی ہماری قوم) موردِ الزام قرار نہیں پاتے۔ ہمیں تو یہ بھی بالتحقیق معلوم نہیں کہ یہ کچھ ہو کیسے گیا!)

بہت اچھا! آپ کو اس کا علم نہیں کہ مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا وہ کیسے ہو گیا! سوال یہ ہے کہ جو کچھ اس وقت مغربی پاکستان میں ہو رہا ہے کیا آپ کو اس کا بھی علم نہیں! مشرقی پاکستان کے سازشیوں نے ۱۹۶۹ء میں علانیہ کہہ دیا تھا کہ جداگانہ قومیت کا جو جذبہ بنگالیوں کے دل میں ابھرا ہے وہی جذبات اب مغربی پاکستان میں بیدار ہو رہے ہیں۔ اس لئے آپ دیکھیں گے کہ ہمارے بعد اب یہی رَو وہاں بھی چلے گی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں بالخصوص سندھ کا نام لیا تھا اور کہا تھا کہ آزاد بنگلہ دیش کی جو تحریک یہاں پروان چڑھ رہی ہے، آزاد سندھو دیش کی اسی قسم کی تحریک وہاں بھی سیلاب بن کر امنڈے گی۔

ہم نے یہ سب کچھ سنا اور بدستور شطرنج کی بازی میں منہمک رہے

بنگلہ دیش" الگ ہوا تو مغربی پاکستان میں چار قوموں کی تحریک بیدار ہو گئی — یاد رکھئے! جداگانہ آزاد مملکت کے مطالبہ کی ابتدا جداگانہ قومیت کے مطالبہ سے ہوا کرتی ہے۔ چار قوموں کے تصور کا اگلا قدم چار سرکاری زبانوں کا تصور ہے جسے اس وقت نہایت معصومانہ انداز سے اٹھایا اور آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ اور آگے بڑھئے۔ ملک میں

جمہوری طریق کے مطابق، مرکز اور صوبوں میں حکومتیں قائم ہیں۔ لیکن سرحد اور بلوچستان نے آہستہ آہستہ مرکز کے وجود سے ہی انکار کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ رفتہ رفتہ ان اختیارات کو بھی اپنے ہاتھ میں لئے جا رہے ہیں جو (عبوری) آئین کی رُو سے مرکز کی تحویل میں ہیں۔ سرحد کے وزیر اعلیٰ مفتی محمود آہستہ آہستہ اپنی حدود اختیارات سے آگے سرکتے چلے جا رہے ہیں۔ کبھی وہ کہتے ہیں کہ صوبوں کی سرزمین میں جو کچھ پیدا ہوتا ہے اس پر مرکز کا کوئی حق نہیں۔ اسے صوبے کے قبضے میں رہنا چاہیئے۔ کبھی فرماتے ہیں کہ "سرحد کے کسی حصے کو مرکزی کنٹرول میں لانے کی کوشش برداشت نہیں کی جائے گی۔ سرحد والے اپنے علاقے کا ایک انچ حصہ بھی کسی کے ہاتھ میں نہیں جانے دیں گے" (نوائے وقت۔ ۱۰ اگست) بلوچستان کے وزیر اعلیٰ عطاء اللہ مینگل، چار جداگانہ قوموں کا نظریہ عام کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ان کی پارٹی (نیپ) کے منشور میں ہے اور سیکولر حکومت بھی اسی منشور کا جزو ہے۔ اگلے دنوں صوبوں کے گورنروں اور وزراء اعلیٰ کی جو کانفرنس نتھیا گلی میں منعقد ہوئی ہے اس سلسلہ میں روزنامہ امروز (لاہور) کی ۱۴ اگست کی اشاعت میں یہ خبر، جلی سرخی کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ:۔

> کانفرنس اس اہم سوال پر بھی غور کرے گی کہ کیا مرکزی حکومت کے علاوہ صوبائی حکومتوں کو بھی غیر ملکوں سے معاملات طے کرنے کا اختیار دے دیا جائے۔

معلوم نہیں کہ کانفرنس میں یہ تجویز زیر غور آئی یا نہیں لیکن اس سے علیحدگی کے جراثیم تو بہرحال فضا میں پھیل گئے (واضح رہے کہ مجیب کے چھ نکات میں ایک اہم نکتہ یہ بھی تھا)۔ اگلے دنوں صدر مملکت مسٹر بھٹو نے کہیں یہ کہہ دیا کہ سرحد اور بلوچستان ہمارے "جونیئر پارٹنر" ہیں۔ اس پر نیپ کے سربراہ ولی خان صاحب تنک کر بولے کہ ہم جونیئر پارٹنر نہیں برابر کے حصے دار ہیں۔ ملک کی آدھی حکومت صدر بھٹو کے قبضے میں ہے اور آدھی ہمارے قبضے میں ہے ــــ گویا اصل حیثیت صوبوں کی ہے۔ مرکزی حکومت کسی حساب شمار میں ہی نہیں۔ انہوں نے (ولی خان صاحب نے) اس سے پہلے ایک دفعہ یہ بھی کہا تھا کہ یہ فیصلہ صوبوں کے کرنے کا ہے کہ وہ کون کونسے اختیارات مرکز کو دینا چاہتے ہیں۔

سرحد اور بلوچستان میں یہ راگ ہنوز نچلے سروں میں الاپا جا رہا ہے۔ (جیسا کہ مشرقی پاکستان کے سازشیوں نے شروع میں گایا تھا۔ زلزلے کے ان خفیف جھٹکوں کا مرکز ثقل سندھ ہے، جہاں کا مجیب ثانی ــ جی۔ ایم۔ سید ــ بالکل اسی کے نقش قدم پر نعل بنعل جا رہا ہے۔ پہلے اس کی سازش زیر زمین تھی۔ اب وہ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ اس سے پہلے مسٹر سید کے کئی ایک بیانات (اور تقاریر کے اقتباسات) طلوع اسلام کے صفحات پر پیش کئے جا چکے ہیں۔ ان میں دو ایک کا اور اضافہ کر لیجئے۔

(۱) روزنامہ نوائے وقت کی ۱۱ اگست کی اشاعت میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

> تحریک جئے سندھ کے راہنما جی۔ ایم۔ سید نے کہا ہے کہ وہ پاکستان کے اندر سندھو دیش قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہماری آزادی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں تو ہم سرزمین سندھ کو خون سے رنگ دیں گے۔ آج (۵ اگست کو) ٹنڈو الہ یار میں تحریک کے زیر اہتمام ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ نہ میں غدار ہوں اور نہ میں بھارت کا ایجنٹ۔ بلکہ غدار اور ایجنٹ وہ مہاجرین ہیں جنہوں نے پاکستان کو ابھی تک دل سے تسلیم نہیں کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ لوگ اگر سندھ سے نہ

گئے تو انہیں زبردستی یہاں سے نکال دیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ مجیب نے پاکستان کے اندر بنگلہ دیش کا مطالبہ کیا تھا۔

تحریک کے ایک اور راہنما یوسف تالپور نے کہا کہ مہاجرین کو یہاں سے واپس جانا پڑے گا۔ انہوں نے صدر بھٹو سے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ بھارت سے پاکستان کے جنگی قیدیوں کو ہرگز واپس نہ لیا جائے کیونکہ انہوں نے بنگلہ دیش میں زیادتیاں کی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہاں بنگلہ دیش کے واقعات کو دہرایا گیا تو سندھی اس سرزمین کو خون سے رنگ دیں گے۔

مسٹر سید نے خان لیاقت علی خان پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا انہوں نے ہندوؤں کو باہر نکالنے کے لئے تنازعات پیدا کئے تھے اور پھر ان کی جائیدادیں مہاجرین کو الاٹ کر دی گئیں۔

(۲) پاکستان کی بنیاد "نظریۂ پاکستان" پر ہے۔ اگر اس نظریہ کو ختم کر دیا جائے تو مملکتِ پاکستان کے جداگانہ وجود کا جواز باقی نہیں رہتا۔ مشرقی پاکستان میں بھی پہلے نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی گئی تھی۔ اب دیکھئے کہ مسٹر سید اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ ذیل کی خبر روزنامہ امروز کی ۴ اگست کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔

جئے سندھ محاذ کے صدر جی ایم سید نے آج بھرگری ہاؤس میں طلبا اور دانشوروں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مہاجرین کو سندھ میں رہنے کا کوئی حق نہیں[1]۔ اور انہیں واپس ہندوستان بھجوا دینا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ بین الاقوامی قانون کے تحت مہاجروں کو ان کے اصل وطن میں بھجوانے کی گنجائش رکھی گئی ہے اور میں نے صدر بھٹو کے ساتھ اپنی حالیہ ملاقات میں ان سے یہ کہا تھا کہ وہ مسز گاندھی کے ساتھ اپنی آئندہ ملاقات میں پناہ گیروں کی واپسی کے سوال پر بات چیت کریں۔ جی۔ ایم۔ سید نے کہا کہ مجھے امید ہے کہ میری پیش گوئی جلد درست ثابت ہو گی اور نظریۂ پاکستان کے ڈھونگ کے تحت حال ہی میں مہاجرین کی نقلِ مکانی کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ اس ڈرامے کی ابتدا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حالیہ واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریۂ پاکستان کا کوئی وجود نہیں اور حقیقت میں سندھیوں کو لوٹنے کے لئے یہ ڈھونگ کھڑا کیا گیا تھا۔

جی۔ ایم۔ سید نے کہا کہ پاکستان چار قومیتوں کا وطن ہے۔ پانچویں قوم کے بسنے کا یہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے اس توقع کا اظہار کیا کہ سندھی جمہوری طریقوں سے پورے ملک کی قومی زبان بن جائے گی کیونکہ پنجاب سرحد اور بلوچستان نے اپنی صوبائی زبانوں کو قومی زبان بنانے کا مطالبہ پیش نہیں کیا۔

(۳) آپ کو یاد ہو گا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے پیش خیمہ کے طور پر یہ پراپیگنڈہ مسلسل و متواتر کیا گیا تھا کہ مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کو لوٹ لیا ہے۔ اس نے اس کا بُری طرح معاشی استحصال کیا ہے۔ یہ ملک اُس خطہ کی کالونی بن کر رہ گیا ہے۔ اس لئے ہم ان کے پنجۂ استبداد سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ سید صاحب

---

[1] مجیب بھی تو یہی کہتا تھا کہ بہاریوں — یعنی مہاجرین — کو وہاں رہنے کا کوئی حق نہیں۔

وہی راگ کن سُروں میں الاپ رہے ہیں۔ کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ اعلان کی ۳۰ر جولائی کی اشاعت میں مسٹر سیّد کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ

> سندھ میں آزادی کی تحریک چلانے کا مقصد سندھیوں کے ساتھ گزشتہ پچیس سال سے کی جانے والی ناانصافیوں اور حق تلفیوں کا خاتمہ کرنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہماری شرطیں مان لی جائیں تو اب بھی حالات سدھر سکتے ہیں ورنہ آزاد سندھو دیش قائم ہو کر رہیگا۔ جی۔ ایم۔ سیّد نے کہا کہ اس وقت سندھی اپنے ہی وطن میں ایک نوآبادی بن کر رہ گئے ہیں۔ سندھ کی آمدنی کا ایک فیصد حصہ بھی سندھ پر خرچ نہیں کیا جاتا ...... اگر مہاجرین یہاں رہنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ انہیں یہاں سے طاقت کے ذریعے نکال دیا جائے گا۔

اس کے بعد اسی اخبار نے ایک پمفلٹ کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے جو "سندھ سجاگ تحریک" کی طرف سے نواب شاہ میں تقسیم کیا گیا تھا۔ وہ یہ ہے:-

> ہم نے تمہیں مہمان سمجھا تھا اور دل میں جگہ دی ہماری مہمان نوازی کے بدلے میں تم نے ہماری ملکیت، جان، آن اور تہذیب کو تباہ کر دیا۔ تم نمک حرام ثابت ہوئے۔ تمہیں ہم خبردار کرتے ہیں کہ ۲۰ر جولائی تک سندھ کو خالی کر دو۔ ورنہ تمہارے خون سے ہمارے ہاتھ رنگے جائیں گے جس کے تم مستحق ہو

(۴) مجیب نے جو کچھ کیا تھا وہ بھارت اور روس کی سازش سے کیا تھا۔ وہی اس کی پرائیویٹ آرمی کو اسلحہ مہیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں سندھ میں کیا ہو رہا ہے، اس کا اندازہ اس خبر سے لگائیے جو روزنامہ نوائے وقت کی ۸ر اگست کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے اور وہ حسبِ ذیل ہے۔

> سندھ اسمبلی کے رکن اور جمعیت علمائے پاکستان کے رہنما جناب عثمان کینیڈی نے کہا ہے کہ مبیّنہ طور پر سندھ کے انتہا پسندوں میں بھارت اور روس کا فراہم کردہ اسلحہ تقسیم کیا جا چکا ہے۔ اور سندھو دیش قائم کرنے کی تیاریاں آخری مرحلہ پر پہنچ گئی ہیں۔ انہوں نے یہ انتباہ آج (۷ر اگست کو) سندھ اسمبلی کے قائدِ حزبِ اختلاف کے کمرے میں ایک پریس کانفرنس کے دوران کیا۔ انہوں نے الزام عائد کیا کہ جی۔ ایم۔ سیّد اور ان کے انتہا پسند ساتھیوں نے نہ صرف سندھ میں اردو جاننے والے لوگوں بلکہ تمام محبِ وطن افراد کے قتلِ عام کا منصوبہ تیار کر لیا ہے اس سلسلہ میں بعض محبِ وطن حرّوں اور ان کے روحانی پیشوا پیر صاحب پگاڑو شریف کے خلاف بھی سازشوں کا انکشاف ہوا ہے۔

(۵) مجیب کے متعلق پہلے تو یہی مشہور کیا جاتا رہا کہ وہ محبِ وطن پاکستانی تھا۔ مغربی پاکستان کے اربابِ حل و عقد کی حماقتوں نے اسے اس انتہائی اقدام پر مجبور کر دیا۔ لیکن حال ہی میں صدرِ مملکت مسٹر بھٹو نے کہا ہے کہ انہوں نے اگرتلہ کیس کا فائل دیکھا ہے۔ مجیب واقعی بھارت کے ساتھ مل کر پاکستان کے خلاف سازش کر رہا تھا۔

کراچی کے روزنامہ نئی روشنی کی ۲۹ر جولائی کی اشاعت میں شائع شدہ خبر کے مطابق پاکستان مسلم لیگ (قیوم گروپ)

کے سیکرٹری جنرل سید ضیا عباس نے انکشاف کیا ہے کہ:-

مسٹر جی۔ ایم۔ سید اپنی نظر بندی کے زمانے میں بھی بمبئی کے ہندوؤں سے مل کر سندھو دیش کی تحریک چلاتے تھے۔

(۶) مشرقی پاکستان میں مسلسل پراپیگنڈہ کے ذریعے پاکستان، نظریۂ پاکستان اور قائدِاعظم کے خلاف اس قدر شدید نفرت کی فضا پیدا کر دی گئی تھی کہ ڈھاکہ میں پاکستانی پرچم جلایا گیا اور قائدِاعظم کی تصویر کو پھاڑ کر اسے پاؤں تلے روندا گیا تھا۔

سندھ میں کیا ہو رہا ہے اس کا اندازہ اس خبر سے لگائیے جو روزنامہ امروز کی ۷ راگست کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ

کل (۵ راگست کو) لیاقت میڈیکل کالج ہسپتال جامشورو میں ایک دلدوز واقعہ ہوا۔ طلباء نے جن میں ہندو طلباء پیش پیش تھے، کالج کے صدر دروازے پر آویزاں شہید ملت لیاقت علی خان کی تصویر کو اتار کر اسے پھاڑ دیا اور پھر ان پرزوں کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ کالج کے انہی ہندو طلباء کے باعث کالج کے ایڈمنسٹریٹر کی وہ کوششیں ناکام ہو گئیں جو انہوں نے اردو بولنے والے طلباء کو کالج میں واپس لانے کے لئے کی تھیں۔

یہ بھی سنا گیا ہے کہ انہوں نے لیاقت میڈیکل کالج کا نام بدل کر لطیف میڈیکل کالج رکھ دیا ہے۔

(۷) روزنامہ نوائے وقت کی ۸ راگست کی اشاعت میں یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ ۷ راگست کو حیدرآباد کی گورنمنٹ پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کے ایک لیکچرار مسٹر عبدالرزاق کو وہاں کے طلباء نے اتنا مارا کہ وہ وہیں دم توڑ گئے۔

(٠)

یہ ہے جو کچھ اس وقت مغربی پاکستان میں ہو رہا ہے۔ اسے دیکھئے اور پھر سوچئے کہ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے کیا یہ بعینہٖ وہی نہیں جو مشرقی پاکستان میں ہوا تھا؟ اور اگر یہاں بھی وہی کچھ ہو رہا ہے تو کیا اس کا نتیجہ بھی وہی نہیں برآمد ہوگا جو وہاں نمودار ہوا تھا۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے کہ ایک قسم کا سبب (CAUSE) ہمیشہ اسی قسم کا نتیجہ (EFFECT) مرتب کیا کرتا ہے۔

یہ سب کچھ قوم کے سامنے ہو رہا ہے لیکن نہ کوئی اس سے پریشان نظر آتا ہے نہ متوشش[1]۔ ارباب اقتدار یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ قوم نے ہمیں پانچ سال کے لئے منتخب کیا ہے۔ اس لئے اس سے قبل ہمیں کوئی ہمارے مقام سے ہلا نہیں سکتا۔ جو عناصر گزشتہ انتخابات میں شکست کھا گئے تھے ان کا مطالبہ ہے کہ (چونکہ ہم شکست خوردہ ہیں اس لئے) سابقہ انتخابات کو کالعدم قرار دے کر نئے انتخابات بلاتاخیر کرائے جائیں۔ اور عوام ہیں کہ بلا ملاح کی

[1] حال ہی میں (۱۰ راگست کو) یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ سندھ میں متعدد لیڈروں کو جن میں مسٹر سید بھی شامل ہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ لیکن یہ گرفتاریاں زبان کے مسئلہ پر فسادات روکنے کے لئے عمل میں لائی گئی ہیں۔ جی۔ ایم۔ سید اور ان کے ہم نوا جو کچھ آزاد سندھو دیش کی تحریک کے سلسلہ میں کہتے چلے آرہے ہیں، اس پر کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔

کشتی کی طرح، موجوں کے رحم و کرم پر بہے چلے جا رہے ہیں۔ قوم یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے اور صورتِ آئینہ خاموش بیٹھی ہے ــــ غالباً اس انتظار میں کہ یہ تماشہ ختم ہو جائے تو پھر ایک اور "حمود الرحمٰن کمیشن" بٹھا دیا جائے۔ یہ تحقیق کرانے کے لئے کہ مریض مرا کس مرض سے تھا؟

لیکن ہم نے غلط کہا۔ مشرقی پاکستان کے چھن جانے کے بعد "حمود الرحمٰن کمیشن" اس لئے بٹھایا جا سکا تھا کہ مغربی پاکستان کا خطۂ زمین باقی تھا۔ اگر (خاکم بدہن) یہ خطہ بھی نہ رہا تو کمیشن کون بٹھائے گا اور وہ بیٹھے گا کہاں؟ غالباً کچھ ایسے ہی کٹھن حالات دلّی (مرحوم) کے جنہیں دیکھ کر غالبؔ نے اس مرثیہ میں جس کی مثال دنیا کے لٹریچر میں کم ملے گی کہا تھا کہ

غم سے مرتا ہوں کہ دنیا میں نہیں اتنا کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

اور یہ کہ ـــ

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

لیکن نہیں! ہمارے لئے ابھی مرثیہ کا وقت نہیں آیا۔ ابھی اس مریضِ ناتواں پر وہ وقت نہیں آیا جہاں دوا کام نہ دے اور مسیحا یہ کہہ کر بالیں سے اٹھ جائے کہ

یوں خدا کی خدائی برحق ہے　　؎　　پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں

ابھی یہ مریض بچ سکتا ہے بشرطیکہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور یہ شرط وہی ہے جسے ہم پچیس سال سے مسلسل پیش کئے چلے آ رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ قوم کو جذبات کی طغیانیوں میں دھکیلنے کے بجائے اسے سوچنا سکھا دیجئے۔ خود بھی جو کچھ کیجئے غور و فکر کے بعد "سوچ سمجھ کر کیجئے" اور قوم کو بھی اسی کا عادی بنا لیجئے۔ یاد رکھئیے! قومیں اس وقت تباہ ہوتی ہیں جب وہ فکر سے عاری ہو جائیں۔ قرآن کریم نے جماعتِ مومنین سے کہا ہے کہ اگر تم میں بیس افراد بھی صاحبِ استقامت ہوئے تو وہ دشمن کے دو سو پر غالب آ جائیں گے۔ اور اگر ایک سو بھی ایسے ہوئے تو فریقِ مخالف کے ایک ہزار کو مغلوب کر لیں گے۔ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ ‎(۸/۶۵)۔ یہ اس لئے کہ یہ (فریقِ مخالف) وہ لوگ ہیں جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ وہ عقل و فکر سے کام لینے والوں کے متعلق کہتا ہے کہ یہ زمین کیا، کائنات کی پستیاں اور بلندیاں سب ان کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں (۴۵/۱۳)۔ یہ ہے قوتِ عقل و فکر کی! عقل و فکر سے کام لینے والی قومیں پہلے اپنے سامنے ایک متعین نصب العین رکھتی ہیں، پھر اس تک پہنچنے کے لئے، موزوں ترین راستہ تجویز کرتی ہیں۔ پھر اس راستے کی مختلف منازل (PHASES) کی نشاندہی کرتی ہیں اور اس طرح وہ محفوظ و مامون، بتدریج اس نصب العین تک پہنچ جاتی ہیں۔ ان کے برعکس، جذبات پرست قوم، جھکڑ کی طرح اٹھتی ہے۔ رفتار دیکھئے تو بجلیوں سے بھی زیادہ، اور نتیجہ دیکھئے تو تخریب ہی تخریب۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ سورج ایک (PLAN) کے مطابق طلوع ہوتا ہے۔ ایک متعین رفتار سے متعین راستے پر سفر کرتا ہوا متعین نصب العین تک پہنچتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دنیا اپنے معاملات کا حساب و شمار اس کے طلوع و غروب اور طریق و رفتار سے کرتی ہے۔ اس کے برعکس، ان مصنوعی سیاروں (SPUTNIKS) کو دیکھئے جو گزشتہ چند سالوں سے فضا میں چھوڑے جا رہے ہیں۔ وہ مسلسل گردش

میں رہتے ہیں — اور کہا جاتا ہے کہ گردش ابد تک ان کے مقدر میں ہے لیکن نہ ان کے نصیب میں کوئی منزل ہے نہ مستقر — گردش ہے بے مقصد — حرکت ہے بے معنی — سفر ہے بلا منزل۔ یہی حالت ہوتی ہے اس قوم کی جو سوچ سمجھ کر کام کرنے کے بجائے جذبات کے بگولے بن کر رہ جائے۔

ہماری قوم ایک عرصہ سے ان بگولوں کی نذر ہو رہی تھی جو موجودہ برسر اقتدار جماعت نے — سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ لگا دیا — یہ خود تیز رو واقع ہوئی تھی، عوام کو اس نے برق رفتار بنا دیا۔ تیز روی اور برق رفتاری الیکشن وغیرہ قسم کے ہنگاموں میں وقتی کامیابی عطا کر دیتی ہے لیکن امور مملکت بڑے گہرے غور و فکر اور لمبی سوچ بچار کے متقاضی ہوتے ہیں۔ امور مملکت میں برق رفتار جذبات پرستی کیا نتائج پیدا کرتی ہے اس کا اندازہ ان اقدامات سے بخوبی لگ سکتا ہے جو موجودہ برسر اقتدار پارٹی نے اپنی مدتِ حکومت کے مختصر ترین عرصہ — چھ سات ماہ — میں کئے ہیں۔ ان کی کچھ مثالیں پیش کرنے سے پہلے ہم اس حقیقت کو دہرا دینا چاہتے ہیں کہ ہم نے صدر بھٹو کی نیت پر کبھی شبہ نہیں کیا اور ہم اپنی اس رائے پر ابھی تک قائم ہیں کہ وہ غدارِ وطن نہیں۔ ہم نے ان کی حکومت کو کبھی مثالی اور معیاری تو نہیں کہا لیکن اس کے باوجود ہم اس کی تاکید کرتے چلے آ رہے ہیں کہ اس حکومت کو ٹھیس نہ پہنچائی جائے کیونکہ یہ اس ملک کی امید کی آخری کرن ہے۔ اس کے بعد یہاں اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ

ہر چند بے ثمری ہے، مگر جیتی تو ہے

اور اس حکومت کے ساتھ ہماری یہی وابستگی توقعات ہے (جسے ہمارے بعض احباب خوش اعتمادی سے تعبیر کیا کرتے ہیں) جو ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کی غلطیوں پہ انہیں ٹوکیں اور ان کی عجلتوں پر بریک لگانے کی کوشش کریں۔

انگریز کی عملداری میں ہوتا یہ تھا کہ جو قدم انہوں نے چھ ماہ بعد اٹھانا ہوتا تھا اس کی بنیاد آج رکھ دیتے تھے۔ دفتر میں ایک کلرک (یا اسسٹنٹ) سے آغاز سخن ہوتا تھا — اس آخری اتھارٹی کے مقابلہ میں جس نے اس معاملہ کا فیصلہ کرنا ہوتا تھا۔ اس کلرک کے فہم و تدبر کی جو سطح ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے لیکن اس کے باوجود، ان سب کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی کہ وہ اپنی اپنی رائے کا اظہار بیباکی سے کریں۔ اس کلرک سے لیکر آخری اتھارٹی تک آٹھ دس چھلنیاں راستے میں آتی تھیں جن میں سے چھن کر یہ مسئلہ آگے بڑھتا تھا پھر اس مسئلہ کے جس قدر گوشے دوسرے محکموں سے متعلق ہوتے تھے ان میں بھی یہ انہی مراحل میں سے گزرتا تھا۔ ان تمام منازل کو طے کرنے کے بعد اس پر آخری فیصلہ لیا جاتا تھا اور وہ بھی اکثر و بیشتر ایک مجلس مشاورت کی رو سے۔ یہ فیصلے لینے والے بلند ترین صلاحیتوں کے مالک ہوتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسے ان خصوصی ماہرین (SPECIALISTS) کے پاس بھیجتے تھے جن کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ ان الفاظ کا انتخاب کریں جن میں اس فیصلہ کا اعلان کیا جائے۔ اتنے مراحل سے گزرنے کے بعد ان کے خیال یا تجویز کا ایک قطرہ گہر بن کر لوگوں کے سامنے آتا تھا۔ یہ تھا وہ طریق کار جس سے وہ سات سمندر پار بیٹھے اتنے وسیع و عریض ملک پر اتنے لمبے عرصہ تک حکومت کر گئے۔[1]

---

[1] یہ طویل المیعاد طریق کار اس وقت "سرخ فیتہ" بن کر بدنام ہوا جب اسے ہمارے ارباب نظم و نسق نے اپنی سہل انگاری اور ذمہ داری سے گریز کا بہانہ بنا لیا۔

اب آپ دیکھئے کہ جب فیصلوں اور اقدامات کی بنیاد، فکر و تدبر کی بجائے جذباتی طغیانی بن جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ ذیل میں اس کی چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ مقصد اس سے تنقیص نہیں، مریض کے لئے پرہیز کی تاکید ہے۔

(۱) صدر بھٹو نے برسرِ اقتدار آتے ہی، دا آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے مجیب کو رہا کر کے "بنگلہ دیش" بھیج دیا۔ اس سے جس قدر نقصان ہوا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اب خود صدر محترم اس پر پشیمان ہیں۔ وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے اب مجیب کا قائل دیکھا ہے جس سے معلوم ہوا کہ وہ اگرتلہ کیس میں بھی مجرم تھا۔ اگر صدر بھٹو پہلے ان کاغذات کو دیکھتے اور پھر تمام نتائج و عواقب پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کے بعد اس اہم ترین مسئلہ کا فیصلہ کرتے تو ہم بہت سی مشکلات اور خود صدر بھٹو بہت سی پریشانیوں سے بچ جاتے۔

(۲) یکایک احکام جاری ہو گئے کہ (سابقہ) ریاستوں کے حکمرانوں کے وظائف بند کر دیئے گئے ہیں لیکن چند ہی دنوں کے بعد اس حکم کو واپس لینا پڑا۔

(۳) سرمایہ داروں سے زرِ مبادلہ لینے کے سلسلہ میں ایسے تخویف آمیز اعلانات کئے گئے کہ ملک کی فضا تھرتھرا اٹھی۔ ان میں سے بعض کو گرفتار کر لیا گیا لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد انہیں بھی رہا کر دیا اور باقیوں کے خلاف بھی کچھ نہ ہوا حتیٰ کہ ان کے ضبط کردہ پاسپورٹ بھی واگذار کر دیئے گئے۔

(۴) چند صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لینے کے بعد اعلان کیا گیا کہ مزید صنعتیں سرکاری تحویل میں نہیں لی جائیں گی۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد مزید صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔ اس سے حکومت کے وعدوں کا اعتماد اٹھ گیا۔

(۵) اعلان کیا گیا کہ جو ملک "بنگلہ دیش" کو تسلیم کرے گا اس سے ہم سفارتی تعلقات منقطع کر لیں گے۔ چنانچہ ایسا کیا بھی گیا۔ لیکن جب روس نے اُسے تسلیم کیا تو ہم خاموش ہو گئے۔ اس سے بین الاقوامی دنیا میں ہمارے اعتماد کو جو دھچکا لگا وہ ظاہر ہے۔

(۶) سینکڑوں سرکاری افسروں اور ملازموں کو "شوکاز نوٹس" دیئے اور تحقیقات کئے بغیر ریٹائر کر دیا اور انہیں پنشن تک بھی نہ دی۔ تھوڑے دنوں بعد اعلان ہوا کہ انہیں اپیل کا حق دیا جائے گا۔ جنہوں نے اپیلیں دائر کیں، ان کا فیصلہ ابھی تک نہیں ہوا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ساری انتظامیہ (ADMINISTRATION) عدم حفاظت (INSECURITY) کا شکار ہو گئی۔ اور ان کے دل سے حکومت کے ساتھ قلبی تعاون کا جذبہ مفقود ہو گیا۔ جب کوئی اپنے آپ کو محفوظ ہی نہ سمجھے تو دل سے کام اور تعاون کیسے کرے؟

(۷) لیبر پالیسی۔ تعلیمی پالیسی۔ صحت پالیسی۔ زرعی اصلاحات وغیرہ اسکیمیں ایسی نیم پختہ حالت میں نافذ کر دی گئیں کہ جنہوں نے انہیں نافذ کرنا ہے نہ ان کی سمجھ میں آتا ہے کہ انہیں نافذ کیسے کیا جائے اور جن پر ان کا اطلاق ہونا ہے نہ انہیں معلوم ہو رہا ہے کہ ان سے مقصود و مطلوب کیا ہے۔ اب اس سلسلہ میں کانفرنسیں کی جا رہی ہیں، کمیٹیاں بٹھائی جا رہی ہیں۔ ترمیمات شائع کی جا رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود صورت یہ ہے کہ ـــ ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں ـــ جو کچھ ہو رہا تھا وہ کالعدم قرار پا چکا ہے جس نے اس کی جگہ لینی تھی وہ "گونگے کا خواب" بن رہا ہے! اس سے ملک میں خلا پیدا ہو گیا ہے اور خلا کا نتیجہ ظاہر ہے کہ انتشار اور خلفشار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس وقت ملک کا

کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں بے اطمینانی نہ ہو۔

(۸) ملک سے مارشل لاء اٹھانے، صوبوں میں گورنر مقرر کئے جانے، عبوری آئین کے پاس کرنے، مستقل آئین کا مسودہ مرتب کرنے اور اسے ۱۴ اگست کو اسمبلی میں پیش کرنے اور اب مزید مہلت مانگنے کے سلسلہ میں جس افراتفری سے کام لیا گیا اور اس سے جو بدمزگیاں پیدا ہوئیں ان کی تلخی متعلقہ حلقوں کے کام و دہن سے ابھی تک نہیں گئی۔ یہی کچھ سوچ سمجھ کر کیا جاتا تو نتائج خوشگوار مرتب ہوتے۔

(۹) نیپ سے پابندی بھی اٹھائی گئی اور اس کے سربراہ کو اپنے مدمقابل بھی کھڑا کر لیا۔ اسے مدمقابل بھی کھڑا کر لیا اور پھر اس کی مرضی کے مطابق سندھ اور بلوچستان میں گورنر بھی تعینات کر دیئے۔ انہیں تعینات بھی کر دیا اور اب ان کے خلاف شکایات ابھر رہی ہیں کہ وہ مرکز کے نمائندے ہونے کے بجائے صوبوں کے مفادات کے محافظ بن رہے ہیں۔

(۱۰) اخبارات پر پابندیوں اور بعض مدیران وغیرہ کی گرفتاری اور رہائی کے سلسلہ میں جو کچھ کیا گیا وہ ارباب متعلقہ کی عجلت کاریوں کی بین مثال ہے۔

(۱۱) سندھ کے لسانی مسئلہ کے سلسلہ میں جو کچھ ملک کو پیش آیا وہ ذمہ دار اصحاب کے عدم تدبر اور جلد بازی کا آئینہ دار ہے۔ اس کا سب سے زیادہ تاسف انگیز پہلو یہ ہے کہ اس سے وہ تخریبی قوتیں جو اپنی موت مر رہی تھیں پھر سے ابھر آئی ہیں اور انہیں حکومت کے وقار اور اعتماد کو دھچکا لگانے کا موقعہ مل گیا ہے۔

(۱۲) صدر مملکت نے خود اعلان فرمایا کہ انہیں حتمی طور پر معلوم ہے کہ اس سلسلہ میں فساد برپا کرانے کے لئے کس سرمایہ دار نے تیس لاکھ روپیہ دیا اور کس جماعت نے فسادات برپا کرائے لیکن اس کے بعد نہ یہ سننے میں آیا کہ اس سرمایہ دار کے خلاف کیا کارروائی کی گئی، نہ یہ کہ اس جماعت کے خلاف کیا قدم اٹھایا گیا۔ نتیجہ یہ کہ اس قسم کے اعلانات اب ملک میں اضحوکہ بن گئے ہیں۔

یہ چند ایک مثالیں ہیں ان اقدامات کی جو غور و تدبر کے بجائے جذبات کی تیزی سے کئے گئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا، یہ ہم سے نہیں خود صدر محترم کی زبان سے سنیئے۔ کراچی اور سندھ کے گذشتہ فسادات کے سلسلہ میں انہوں نے اس چلچلاتی دھوپ اور جگر سوز موسم میں جس دردو کرب سے سندھ کے صحراؤں کی خاک چھانی ہے وہ گہری ہمدردی کا مستحق ہے۔ لیکن ان جانکاہ مشقتوں اور الم انگیز صعوبات کا جو نتیجہ برآمد ہوا وہ بڑا تاسف انگیز ہے۔ انہوں نے دادو کے مقام پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> مجھے زیادہ صدمہ یہ ہے کہ ادھر میں فساد زدہ علاقوں کا دورہ کر رہا ہوں اور ادھر مجھے اطلاع ملی ہے کہ کراچی میں پھر فساد کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ باہمی اتحاد، صلح و صفائی اور امن قائم کرنے کی اپیلیں کرتے کرتے میرا گلہ بیٹھ گیا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں فسادات کے ہر محل وقوع پر بار بار جا کر لوگوں کو تلقین کروں اور ان کے غصے کو ٹھنڈا کروں۔ انہوں نے کہا کہ ایک عوامی منتخبہ حکومت کا سربراہ ہوتے ہوئے میں عوام کا حد درجہ احترام کرتا ہوں لیکن ہر بات کی کوئی حد ہوتی ہے۔ آخر میں بھی انسان ہوں..... میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا مجھے اپنا دورہ امن پھر شروع کر دینا چاہیئے۔ میں چپے چپے پر پولیس

متعین نہیں کر سکتا اور گھر گھر پہ پہرہ نہیں لگا سکتا۔ نہ میں ہر گھر کی حفاظت پر فوج مامور کر سکتا ہوں۔
حکومت کے خلاف دل کے پھپھولے پھوڑنے کا یہ طریقہ ہرگز نہیں چلے گا۔ ہم ہر ایک کے تحفظ کی
ہر امکانی کوشش کر رہے ہیں لیکن آپ خود ہی انصاف کیجئے کہ اگر اس قسم کے ہمہ گیر فسادات
شروع ہو جائیں تو کس کس کی حفاظت کی جا سکے گی۔ (نوائے وقت۔ ۲۷ر جولائی ۱۹۷۲ء)

اس تقریر کا ایک ایک لفظ اس حقیقت کا غماز ہے کہ یہ ایک دُکھے ہوئے دل کی پکار ہے، ایک تھکے ہوئے راہی کی فریاد ہے۔ ہمیں اس کے لئے صدر محترم سے دلی ہمدردی ہے۔ لیکن ـــ جو غم ہی جانگداز تو غم خوار کیا کرے ـــ اس ضمن میں ہم صدر محترم کی خدمت میں بصد ادب ایک گزارش کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اس میں ذرا شک نہیں کہ ملک میں وہ عناصر بڑی گرمجوشی سے مصروفِ کار ہیں جو آپ کی حکومت کو کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتے۔ لیکن ان کے پاس اپنا کوئی پروگرام نہیں۔ وہ ان غلطیوں (بلکہ معاف فرمائیے، ان حماقتوں) سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو آپ کے اربابِ حکومت سے قدم قدم پر سرزد ہوتی ہیں۔ کاروبارِ حکومت، بازیچۂ اطفال نہیں۔ یہ دنیا میں "خدائی کرنا" ہے۔ اس کے لئے اعلیٰ صلاحیت، پختہ کاری، وسیع تجربہ اور بلند کرداری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے محض بیلیٹ بکس کی رائے شماری کافی نہیں ہوتی ـــ اقبالؒ کے الفاظ میں، ـــ نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند ـــ یہ ضروری نہیں کہ آپ کی پارٹی کے جو لوگ آپ کے ساتھ منتخب ہو کر آ گئے ہیں، وہ کاروبارِ شہریاری کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکنے کے بھی اہل ہوں۔ تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ ان میں سے بیشتر اس کے اہل نہیں۔ اس لئے اگر آپ فی الواقعہ اس خطۂ زمین کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس ملک کے رہنے والے آبرومندانہ زندگی بسر کر سکیں (اور ہم اس اعتماد پر آپ کی خدمت میں یہ گزارش کر رہے ہیں کہ آپ ایسا چاہتے ہیں) تو آپ اپنی پارٹی کے باہر سے ایسے اربابِ دانش و بینش کو اپنے ساتھ ملائیں جو حکومت چلانے کا تجربہ اور صلاحیت رکھتے ہوں۔ ملک میں صلاحیتوں (TALENTS) کی کمی نہیں، طلب و جستجو شرط ہے۔ انہی اربابِ دانش و بینش اور اصحابِ فکر و تدبر کا تعاون ہوگا جس سے سیاست و حکومت کی کشتی جذبات کے بھنور سے نکل کر سوچ اور سمجھ کے ساحل کی طرف آ جائے گی۔ اس سے آپ بھی موجودہ پریشانیوں سے نجات حاصل کر سکیں گے اور ملک کے محفوظ رہنے کی صورت بھی پیدا ہو جائے گی۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ مخالفین کی ریشہ دوانیوں سے نمٹنے کا طریق یہ نہیں کہ آستینیں چڑھا کر انہیں دعوتِ مبارزت دی جائے۔ اس کے لئے قرآن کریم کا یہ ابدی اصول پیشِ نظر رکھئے کہ

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ۔ (۱۱/۱۱۴)

یاد رکھو! تخریبی کارروائیوں کو ناکام بنانے کا طریق یہ ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ تعمیری کام کرو۔

اس وقت تک آپ کی حکومت کی طرف سے تعمیری کاموں کے لئے دعوے بہت ہوتے ہیں۔ اسکیمیں بھی بہت سی مرتب ہوتی ہیں لیکن عملاً تعمیری کام بہت کم ہوا ہے۔ اس کے برعکس، ملک کا نظم و نسق تہ و بالا ہو گیا ہے۔ قانون کا احترام اٹھ گیا ہے۔ جرائم عام ہو گئے ہیں۔ پُرامن شہری ہر وقت ہراساں اور ترساں و لرزاں رہتے ہیں۔ عوام کی معاشی حالت بہت سقیم ہو گئی ہے۔ بیکاری بڑھ گئی ہے۔ کاروبار ختم ہو رہے ہیں۔ اشیائے صرف کی قیمتیں دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں۔ تدبر کا تقاضا یہ ہے کہ اربابِ حکومت کی جو توانائیاں مخالفین کے پیچھے دیوانہ وار بھاگے پھرنے میں ضائع ہو رہی ہیں، انہیں تعمیری

کاموں کے لئے صرف کیا جائے۔ اس سے تخریبی عناصر یوں خاسر و نامراد رہ جائیں گے جس طرح سورج نکلنے پر چمگادڑیں تاریکی میں منہ چھپا لیتی ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی تخریبی عنصر ملک میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرے تو اس کی ایسی سختی سے گرفت کیجئے جو باقیوں کے لئے باعثِ عبرت ہو۔ اس میں ملک کے سنجیدہ طبقہ کا تعاون آپ کو یقیناً حاصل ہوگا۔

(تحریر نمود۔ ۱۷ اگست)

(۰)

امسال یوم آزادی کی تقریب پر بزم طلوع اسلام لاہور کے زیر اہتمام ۱۳ اگست کی صبح جو پبلک جلسہ وائی ایم سی اے ہال میں منعقد ہوا وہ اہمیت اور جاذبیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حال کی گنجائش طلوع اسلام کی پیش کردہ قرآنی فکر کی کشش کی اب حریف ہو نہیں سکتی۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ لاہور میں کوئی اور پبلک ہال اس سے وسیع تر اور موزوں تر موجود ہی نہیں۔ اس لئے اس پر اکتفا کرنے اور ارباب شوق کے ہجوم کی دوستانہ شکایتوں کا ہدف بننے کے سوا چارہ نہیں ہوتا۔ اس اجتماع میں مفکر قرآن کا خطاب نہیں تھا، ایک دُکھے ہوئے دل کی آہ جگر پاش تھی جو سب کو تڑپا گئی۔ ہر ایک کو رُلا گئی۔ یہ خطاب چند صفحات آگے جا کر آپ کے سامنے آ رہا ہے۔ اس سے اسکی اہمیت اور افادیت کا اندازہ آپ خود لگا سکیں گے اور ہم سے یقیناً متفق ہوں گے کہ موجودہ حالات میں ضرورت ہے کہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر ہم اسے پمفلٹ کی شکل میں الگ بھی چھاپ رہے ہیں۔ ہمارے بس میں ہوتا تو ہم اسے ملک کے ہر سکول اور ہر کالج کے طالب علم تک پہنچاتے اور اسے ان کے نصاب کا جزو بنا دیتے۔ لیکن یہ وہ آرزو ہے جو اس ملک میں شاید ہی شرمندۂ معنی ہو سکے۔ اگر یہاں طالب علموں کو سنبھال لیا جاتا تو نہ یہ "خدا فراموشوں" اور "خدا پرستوں" کی راتفلوں کے کارتوس بنتے، نہ ہمیں یہ دن دیکھنے نصیب ہوتے۔

(ہبٹر)

محترم پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

کراچی میں

ہر اتوار۔ صبح ۹½ بجے

(بذریعہ ٹیپ)

بمقام۔ دفتر بزم طلوع اسلام۔ 1/14 فردوس مارکیٹ

(بالمقابل بس سٹاپ، پہلی چورنگی۔ ناظم آباد۔ کراچی 18)

لاہور میں

ہر اتوار۔ صبح ۸½ بجے

بمقام

۲۵/بی۔ گلبرگ (۲)۔ لاہور

طلوع اسلام کالج فنڈ

پسلسل فہرست مطبوعہ طلوع اسلام بابت جولائی ۱۹۷۲ء حسب ذیل عطیات بہ شکریہ موصول ہوئے۔

فہرست "الف"

۱۔ محترم انوار حسین سید صاحب۔ لاہور ۲۵۰۰/-
۲۔ محترمہ بیگم شمیم سید صاحبہ۔ " ۲۵۰۰/-

فہرست "ب"

۳۔ محترم محمد عرفان صاحب۔ تحصیل مری ۵/-
۴۔ " محمد ارشاد صاحب۔ " ۱۰/-
۵۔ " ملک حنیف وجدانی صاحب تحصیل مری ۵/-
۶۔ کراچی کے ایک مخیر دوست جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے ۱۰۰/-
۷۔ میسرز امام شاہ محمد اینڈ سنز۔ ملتان ۵,۵۰۰/-
۸۔ محترم حکیم قمر النعمان ثقلینی صاحب۔ جلالپور جٹاں ۲۵۰/-
۹۔ بزم طلوع اسلام۔ سیالکوٹ ۱۰۰/-
۱۰۔ " " " سید حسن (جہلم) ۵۰/-
۱۱۔ محترم علی احمد صاحب اچھرہ۔ لاہور ۵۰/-
۱۲۔ " معصوم علی شاہ صاحب " " ۱۰/-
۱۳۔ عزیزی وسیم احمد صاحب۔ گلبرگ۔ لاہور ۵/-
۱۴۔ " ندیم احمد صاحب۔ " ۵/-
۱۵۔ عزیزہ نوشابہ نذر صاحبہ " ۵/-
۱۶۔ محترم نذیر احمد صاحب۔ " ۵/-
۱۷۔ عزیزہ خالدہ سرور صاحبہ۔ ماڈل ٹاؤن (لاہور) ۱۵۰/-
۱۸۔ محترم حافظ عبدالمجید صاحب۔ پنڈدادنخان ۱۰/-
۱۹۔ محترم محمد اقبال صاحب علی پور (مظفر گڑھ) ۴۰/-
۲۰۔ " ممتاز الدین صاحب۔ کراچی ۱۰/-
۲۱۔ " غلام محمد صاحب۔ کرک (کوہاٹ) ۳/۳۰
۲۲۔ " بشیر احمد صاحب۔ ملکوال ۱۵/-
۲۳۔ " محمد الطاف صاحب۔ لاہور ۱۰/-
۲۴۔ " ظہور الدین بھٹی صاحب۔ " ۱۵/-
۲۵۔ " چوہدری علی شیر چشتی صاحب۔ بہاولپور ۱۵/-
۲۶۔ " نصر اللہ خاں صاحب۔ سیالکوٹ ۷/-

مذکورہ ذیل دو صد روپے کے عطیات
محترم محمد اسلام صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام
کراچی کے ذریعہ وصول ہوئے۔

۲۷۔ محترم راجہ بشیر محمد صاحب۔ کراچی ۵/-
۲۸۔ " محمد عالم حسین صاحب۔ " ۱۰/-
۲۹۔ " افضال احمد خان صاحب۔ " ۱۰/-
۳۰۔ " ایس۔ اے حسنین صاحب۔ " ۱۰/-
۳۱۔ " ایل حسین صاحب۔ " ۱۰/-
۳۲۔ " سید صاحب۔ " ۱۰/-
۳۳۔ " محمد یعقوب صاحب۔ " ۱۰/-
۳۴۔ محترمہ شکیلہ رضوی صاحبہ۔ " ۳۵/-
۳۵۔ محترم عبدالمجید باعکظ صاحب } کراچی ۱۰۰/-
۳۶۔ محترمہ زبیدہ باعکظ صاحبہ }

نوٹ: قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور کو دیئے گئے عطیات ایس آر۔ او نمبر ۶۸۴(K)/۲۵۴ مورخہ ۴۵/۵/۱ مطبوعہ گزٹ آف پاکستان، پارٹ I مورخہ ۵/۱۳ کی رو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن ۵/۱۵ کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

(سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) لاہور

ابلیس و آدم

پرویزؔ صاحب کی اس یگانۂ روزگار تصنیف کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا اور جلدی ختم ہو گیا تھا۔ اسکے بعد انکی تازہ تصنیفات کا سلسلہ کچھ اس طرح علی التواتر جاری رہا کہ سابقہ کتابوں کے جدید ایڈیشنوں کی باری نہ آسکی حالانکہ تشنگانِ شوق کیطرف سے ان کے تقاضے برابر موصول ہوتے رہے۔ للہ الحمد کہ اب ان تصانیف کے

تازہ ایڈیشن چھپنے شروع ہو گئے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ان کی معرکۃ الآراء کتاب

ابلیس و آدم

باندازِ نَو سامنے آرہی ہے کیونکہ مصنف نے بیس سال کے بعد نظرِ ثانی سے اس میں بہت سی تبدیلیاں کی ہیں — کتاب کے موضوعات سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے یعنی

① "پہلا انسان" کیسے پیدا ہوا؟
② قصۂ آدم کا مفہوم کیا ہے؟
③ ابلیس کون ہے؟
④ شیطان کسے کہتے ہیں؟
⑤ جنات سے کیا مراد ہے؟
⑥ ملائکہ کی حقیقت کیا ہے؟
⑦ وحی کیا ہوتی ہے؟
⑧ رسالت کا انقلابی مشن کیا تھا؟

ایسے اہم عنوانات سے متعلق پرویزؔ صاحب کی قرآنی فکر اور حسین قلم کا امتزاج — کتاب دبیز سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ بڑی تقطیع۔ ضخامت قریب (۴۰۰) صفحات۔ مضبوط جلد۔ دیدہ زیب گرد پوش۔

قیمت۔ (علاوہ محصول ڈاک) **۱۵ روپے**

(ملنے کا پتہ)

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور • مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کا خطاب

تقریب یومِ آزادی - ۱۳ اگست ۱۹۷۲ء

قائداعظم! آپ کہاں ہیں؟

کچھ نقش تری یاد کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سر و ساماں سہی ویراں تو نہیں ہے

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر! سلام و رحمت۔

ہماری ملی زندگی میں آج کے دن سے زیادہ عزیز اور عظیم دن کوئی نہیں کہ اس دن ہم نے انگریز اور ہندو کی غلامی سے نجات حاصل کر کے اپنی آزاد مملکت کا افتتاح کیا تھا ما سوائے سالِ گذشتہ کہ ہمارا سیاسی مطلع گرد آلود تھا ہم اس تقریب کو بطور جشنِ مسرت مناتے رہے ہیں لیکن اس سال جو میں آپ کے سامنے حاضر ہو رہا ہوں تو جذبات کی ایک عجیب دنیا دل میں لئے ہوئے سامنے کچھ ایسے سمجھئے جیسے کوئی بوڑھا باپ اپنے ان جواں سال جڑواں بیٹوں کی سالگرہ منا رہا ہو جن میں سے ایک کو وہ سپردِ خاک کر چکا ہو اور دوسرے کی تیمار داری میں مصروف۔ پچھلے سال اس سوختہ بخت ملک اور حرماں نصیب قوم پر جو کچھ بیتی، اور آج جن متذبذب آمیز حالات سے ہم گزر رہے ہیں، اس کے احساس سے دل کا خون خود بخود کھنچ کر آنکھ میں آجاتا ہے۔ اور یہ تنہا ــــ مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا ــــ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کسی کے ساتھ تعلقات جس قدر گہرے ہوں، اور ان کی مدت جتنی طویل، اسی نسبت سے اس کی بربادی کا غم شدید اور اس کی تباہی کا صدمہ عمیق ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے میں کہہ سکتا ہوں کہ آج پاکستان میں بہت کم ایسے ہوں گے جن کا سینہ مجھ ایسا فگار اور جن کا قلب جیسے اس قدر برنگِ غنچہ لبریز جراحت ہو میری کیفیت یہ ہے کہ:

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

پاکستان کے ساتھ میرے تعلقات کی گہرائی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس کا حصول میرے نزدیک تقاضائے دین تھا اور اس خطۂ پاک کا تحفظ میرا جزوِ ایمان بنا رہی ان تعلقات کی مدت، تو اس کے متعلق اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ

تو اپنی بزمِ ناز کو دیکھ اور ازل کو دیکھ ؎ آیا کہاں سے تیری تمنا لئے ہوئے۔

۱۹۱۳ء کا پاکستانی

میں اس زمانے کا پاکستانی ہوں جب ہنوز پاکستان کا نام بھی کسی نے نہیں سنا تھا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ میں جنگِ بلقان کے زمانے سے کہ میری عمر بمشکل آٹھ نو سال کی ہوگی، ملتِ اسلامیہ کی سیاست سے دلچسپی لینے لگ گیا تھا۔ اس کے بعد خود ہندوستان میں متعدد تحریکیں آندھیوں

کی طرح اٹھیں اور آنسوؤں کی طرح بیٹھ گئیں لیکن ان میں سے کوئی بھی میرے لئے گلبانگِ تسلی نہ ہوئی تا آنکہ آج سے بیالیس سال پہلے ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے الٰہ آباد کے مقام پر اپنے مشہور خطبۂ صدارت میں اس منزل کی نشاندہی کر دی جو میرے لئے قبلۂ مقصود اور کعبۂ مدعا بن گئی۔ انہوں نے فرمایا تھا:

> ہندوستان، دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی تعلق کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی رسول کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک نہیں آیا تھا..... اس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک معاشرتی نظام کی شیرازہ بندی میں اپنی جگہ فٹ ہو (اور یہ چیز اپنی آزاد مملکت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی) اس لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر دی جائے..... اس سے اسلام اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔

اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ اسلام مذہب نہیں، دین یعنی نظامِ حیات ہے، اور یہ نظامِ حیات اسی صورت میں زندہ اور قائم ہو سکتا ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ اس سے اپنی آزاد مملکت کا حصول میرے لئے تقاضائے دین بن گیا۔

۱۹۳۷ء میں جب قائدِ اعظمؒ علامہ اقبالؒ کے اس تصورِ اسلام کو عملی پیکر میں متشکل کرنے کے لئے مصروفِ جدوجہد ہوئے تو انہوں نے ایک دن مجھے یاد فرمایا اور کہا کہ میں جانتا ہوں کہ یہ تحریک جسے لیکر ہم اٹھے ہیں، تمہارے لئے تقاضائے دین ہے۔ اس میں ہمارا مقابلہ تین محاذوں پر ہوگا — انگریز، ہندو اور نیشنلسٹ علماء جو "قال اللہ اور قال الرسول" کے پردے میں اس تحریک کی مخالفت کرینگے۔ پہلے دونوں دشمنوں سے ہم نمٹ لیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ تیسرا محاذ تم سنبھال لو۔

طلوعِ اسلام کا اجراء

اور اس طرح اپریل ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام کا اجراء عمل میں آیا۔ اُس وقت گنتی کے دو چار علمائے کرام کے سوا، باقی سب اس تحریک کے مخالف تھے — (مولانا) ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی، احمد سعید دہلوی، مفتی کفایت اللہ، وغیرہ ان کے سرخیل تھے اور ان کے علم و فضل کی دھاک، ہندوستان ہی میں نہیں، تمام عالمِ اسلام میں بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ سب ایک طرف تھے اور طلوعِ اسلام تنہا دوسری طرف۔ اس نے اُن کی یورشوں کا مقابلہ کس جرأت سے کیا اور انہیں ہر میدان میں کس طرح عبرت آمیز شکست ہوئی اس پر اُس زمانے کے طلوعِ اسلام کے فائل شاہد ہیں۔ مابہ النزاع مسائل دو ہی تھے۔ یعنی

(۱) اُن کا دعویٰ تھا کہ ایک ملک یا مملکت کی حدود میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم — ہندو اور مسلم — سب مل کر ایک قوم بن جاتے ہیں۔ اس قوم کی اپنی مملکت ہوتی ہے اور اپنی حکومت۔

اس کے برعکس، ہمارا دعوےٰ یہ تھا کہ قرآن کریم کی رُو سے معیارِ قومیت، حسب نسب، رنگ، خون، وطن یا

مملکت کا اشتراک نہیں، بلکہ ایمان کا اشتراک ہے۔ مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بستے ہوں، ایک قوم کے افراد ہیں۔ اور غیر مسلم خواہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ایک ہی ملک میں کیوں نہ رہتے ہوں، دوسری قوم۔ اس نظریۂ قومیت کی رُو سے ہندوستان میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم، دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اسے دو قومی نظریہ یا (TWO-NATION THEORY) کہا جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:-

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے!

(۲) دوسرا نکتۂ اختلاف یہ تھا کہ نیشنلسٹ علماء کہتے تھے کہ جب ہندوستان کے ہندو اس امر کی ضمانت دیتے ہیں کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے عقاید و عبادات اور شخصی قوانین پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوگی تو پھر ہمیں الگ مملکت قائم کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ اور ہمارا دعویٰ یہ تھا کہ اسلام عقاید و عبادات اور شخصی قوانین ہی کا نام نہیں۔ جب تک زندگی کے ہر شعبے پر احکام و قوانین خداوندی کی حکمرانی نہ ہو مسلمان اپنے آپ کو آزاد تصور نہیں کر سکتا۔ نیشنلسٹ علماء کا یہی مسلک تھا جس پر تنقید کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ہمارے ان دونوں دعاوی کا نام نظریۂ پاکستان تھا۔ دس برس تک قائدِ اعظمؒ اور ان کے رفقاء مسلسل اور پیہم ان دعاوی کو دہراتے رہے یعنی یہ کہ اسلام کی رُو سے ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اور مسلمان صحیح اسلامی زندگی بسر کر نہیں سکتے جب

آزادی کی پہلی عید

تک ان کی اپنی آزاد مملکت نہ ہو۔ دس برس کی مسلسل جنگ کے بعد بفضلِ ایزدِ متعال، پاکستان وجود میں آ گیا۔ اور ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کو اس کے یومِ تاسیس کے تین دن بعد ہم نے اپنی آزاد مملکت میں پہلی نمازِ عید ادا کی ۔۔۔ وہ عید جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت بھی غم و آلام کے بادل ہمارے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ ہندوؤں نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا اور ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے بخاک و خون غلطیدہ اس نوزائیدہ مملکت کی ذمہ داری بن رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہم نہ افسردہ تھے نہ پژمردہ۔ اس لئے کہ اگرچہ آخرِ شب کے یہ جھلملاتے ہوئے چراغ گل ہو رہے تھے تو سامنے پاکستان کے مستقبل کا آفتابِ جہاں تاب ضوفشانیوں کی ہزار دنیائیں اپنے جلو میں لئے ابھرتا نظر آ رہا تھا۔ اور افق کے اس پار سے یہ نوید جانفزا باعثِ صد تسکین اور وجہِ ہزار تسلی ہو رہی تھی کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا۔

پاکستان کا تصور دینے والا اقبالؒ اس سے نو سال پہلے دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور اسے عملاً متشکل کرنے والا قائدِ اعظمؒ ایک سال بعد اپنے رفیق سے جا ملا۔ اور اس کے بعد دنیا نے بصد حیرت و استعجاب یہ تماشہ دیکھا کہ جس بنیاد پر اس مملکت کی عمارت استوار ہوئی تھی اس قوم نے خود اپنے ہاتھوں کھود ڈالا ۔۔۔ كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا۔ (۱۶/۹۲) اس بڑھیا کی طرح جس نے دن بھر بڑی محنت اور مشقت سے سوت کاتا اور شام کو

زوال کی ابتداء

اسے خود اپنے ہاتھوں ادھیڑ دیا۔ اور تعجب بالائے تعجب کہ ساری قوم ہی اس ادھیڑنے کے شغل میں مصروف ہو گئی۔ اس "پاگل خانے" میں طلوعِ اسلام کی ایک آواز تھی جو پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ اے دیوانو! سوچو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کا انجام کیا ہو گا؟ انہوں نے یہاں آتے ہی ایک طرف پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم قرار دے دیا اور اس طرح دو قومی نظریہ کا خود ہی ابطال کر دیا۔ پھر انہوں نے صوبائی تفریق اور بنگالی، پٹھان، پنجابی، سندھی، بلوچ کے امتیاز کی گرہیں مضبوط کر کے ایمان کے اشتراک کی بنا پر امت واحدہ کے تصور کو ملیا میٹ کر دیا۔ باقی رہا دوسرا دعویٰ (یعنی یہ کہ یہ مملکت اس لئے حاصل کی گئی ہے کہ ہم یہاں قوانین خداوندی نافذ کر سکیں) سو اسے اسلام کے اجارہ داروں نے عملاً ناممکن بنا دیا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ "مملکت کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہو گا" اور طلوعِ اسلام نے انہیں متنبہ کیا کہ یاد رکھو! کتاب و سنت کی رو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ قرآن کریم کو بنیاد قرار دے کر ضابطۂ قوانین مرتب کرو۔ اس پر انہوں نے طلوعِ اسلام کو منکرِ حدیث اور منکرِ سنت قرار دے کر کفر کا فتویٰ صادر فرما دیا۔ اور اپنے اسی مطالبہ کو دہراتے رہے۔ بالآخر انہیں تیئیس برس کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کتاب و سنت کی بنیادوں پر فی الواقعہ ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا۔ (ملاحظہ ہو مودودی صاحب کا بیان شائع شدہ ایشیا مورخہ ۲۳ راگست ۱۹۷۰ء)۔ لیکن اتنے میں ہماری نئی نسل یہ سمجھ کر کہ اسلام اب ناممکن العمل ہو چکا ہے سیکولر حکومت پر آ چکی تھی۔ مطالبۂ پاکستان کے دونوں ستون یوں منہدم ہو گئے ـــــ تیئیس برس کے بعد اب سب مطالبہ ہی دو حساب سے یوں پاک ہو گئے۔

بنگالی، پٹھان، پنجابی، سندھی، بلوچ کے امتیاز نے جداگانہ قومیتوں کے جراثیم کی پرورش کی اور علماء حضرات کے اس ناممکن العمل مطالبہ نے سیکولر حکومت کے تصور کو عام کیا۔ اس طرح پاکستانی مسلمانوں میں کوئی شے وجہِ اشتراک نہ رہی۔ اس کا پہلا نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں رونما ہوا۔ اور اب وہی رَو

چار قوموں کا نظریہ

مغربی پاکستان میں چل رہی ہے۔ یہاں ۱۹۷۰ء میں یہ آواز بلند ہوئی (اور اس میں فیض احمد فیض اور جوش ملیح آبادی قسم کے لوگ پیش پیش تھے) کہ مغربی پاکستان میں ایک قوم نہیں چار قومیں بستی ہیں (ملاحظہ ہو طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۷۲ء صفحہ ۲۲)۔ یہ آواز بڑی خطرناک تھی اور پاکستان کو ختم کر دینے کا نہایت مؤثر حربہ۔ اس لئے کہ جب آپ کسی قوم کا الگ وجود تسلیم کر لیتے ہیں تو اس کے بعد اس کے جداگانہ آزاد مملکت کے مطالبہ کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے مطالبہ پاکستان کی بنیاد بھی تو اسی دعویٰ پر تھی کہ ہم ایک الگ قوم ہیں۔ جونہی ہم نے اس دعویٰ کو تسلیم کرا لیا، پاکستان کی جداگانہ مملکت کا مطالبہ ناقابلِ استرداد ہو گیا۔ یہ "چار قوموں" کا سنپولیہ خاموشی ہی خاموشی میں پرورش پاتا چلا گیا تا آنکہ اب یہ خطرناک اژدہا بن کر پھنکارتا پھرتا ہے۔ سندھ میں یہ آواز عام ہو چکی ہے۔ جی۔ ایم۔ سید مُصر ہے کہ سندھیوں کو الگ قوم تسلیم کیا جائے۔ بلوچستان کے وزیراعلیٰ عطاء اللہ مینگل کا یہ بیان ابھی حال ہی میں (۲۷ر جولائی ۱۹۷۲ء کے نوائے وقت میں) شائع ہوا ہے کہ "نیشنل عوامی پارٹی بچے کھچے پاکستان میں چار اقوام کی موجودگی کی قائل ہے"۔ اسی اخبار کی ۲۸ر جولائی کی اشاعت کے اداریہ میں کہا گیا ہے کہ:-

> مرکزی وزیر مواصلات اور سیاسی امور مسٹر غلام مصطفیٰ جتوئی نے گذشتہ روز میرپور خاص میں اپنی پارٹی کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے بالکل واضح طور پر کہہ دیا کہ پارٹی (یعنی پیپلز پارٹی) کے منشور

> کے مطابق پاکستان میں چار قومیں ــ سندھی، پنجابی، پٹھان اور بلوچ آباد ہیں اور پارٹی منشور کے مطابق کام کرے گی۔[1]

اتنا ہی نہیں، یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ پاکستان میں سیکولر حکومت قائم ہو گی ــ اور یہ بات نئی نہیں۔ آج سے بہت پہلے اسے بلند کیا گیا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں پاکستان کے سابق چیف جسٹس منیر صاحب نے پاکستان ٹائمز میں ایک مبسوط مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا (DAYS TO REMEMBER)۔ اس کے آخر میں انہوں نے کہا تھا کہ

> تشکیلِ پاکستان کے وقت کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہو گی۔

جسٹس منیر صاحب کے تتبع میں ہماری نئی نسل کے ایک نوجوان نے، اسی اخبار کی ۱۷ جولائی ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ۔

> پاکستان کی تشکیل کا اصل مقصد تو سیاسی اور معاشی اقتدار حاصل کرنا تھا لیکن اس مطالبہ کو عوام کے سامنے جذباتی اور مذہبی سوال بنا کر پیش کیا گیا تاکہ اس سے یہ عوامی تحریک بن سکے۔

یہ کہتے ہوئے ہمارے اس عزیز کو اتنا خیال بھی نہ آیا کہ اس سے وہ بانیٔ پاکستان کے خلاف ایسا الزام عاید کر رہا ہے جس کی جرأت ان کے بڑے سے بڑے مخالف کو بھی نہ ہوتی تھی۔ (یہ ضمنی بات تھی) پہلے یہ آواز دبی دبی سی اٹھ رہی تھی لیکن مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد اب اس کا الاپ نہایت اونچے سُروں میں شروع ہو گیا ہے۔ میں اس مقام پر اس کی دو ایک مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ کوئی صاحب ہیں پروفیسر احمد حسن دانی۔ ان کا ایک طویل مقالہ (بعنوان پاکستان نیشن ہُڈ) جریدۂ پاکستان ٹائمز کی ۱۳ جون ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس میں وہ رقمطراز ہیں۔

> بنا بریں پاکستانی قومیت کی بنیاد اسلام کی روحانی اقدار نہیں کیونکہ اسے اسلام کے کسی فلسفہ کی سند حاصل نہیں۔ اس کی بنیاد وہ تاریخی عوامل ہیں جن سے یہاں کے مسلمان دوچار رہتے۔

حامد محمود صاحب پاکستان کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کا ایک مبسوط مقالہ روزنامہ پاکستان ٹائمز کی ۴ جون ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب صدر بھٹو مذاکرات کے لئے شملہ تشریف

---

[1] ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ پیپلز پارٹی کا ایک مرکزی وزیر یہ کہہ رہا ہے اور اسی پارٹی کے دوسرے مرکزی وزیر کوثر نیازی صاحب کچھ اور فرما رہے ہیں۔ چنانچہ ۲ جولائی ۱۹۷۲ء کے اخبار نوائے وقت میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ انہوں نے پاکستان سنٹر کے افتتاح پر تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے جو دو قومی نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آئی تھی۔ یہ نظریہ علامہ اقبالؒ نے پیش کیا اور برصغیر کے مسلمانوں نے قائد اعظمؒ کی قیادت میں اس نظریہ کے حصول کے لئے جدوجہد کی"۔ انہوں نے اس پر دکھ کا اظہار کیا کہ کچھ عناصر ملک میں پانچ قومیتوں کے نظریہ کے پرچار میں مصروف ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ لوگ بزدل ہیں اور کھلے بندوں دل کی بات زبان پر نہیں لاتے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم ان قومیتوں کی سازشوں میں الجھ رہی ہے حالانکہ قومیتیں قوم سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ مولانا نے کہا کہ ان لوگوں نے چونکہ دو قومی نظریہ کی خاطر جدوجہد نہیں کی اس لئے ان کا اس کے ساتھ کچھ لگاؤ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان علاقائی رشتوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ نظریاتی بنیادوں پر وجود میں آیا تھا اور پاکستانی ایک قوم بنے تھے۔ مسلمانوں کا زوال اس وقت شروع ہوا جب انہوں نے علاقائی بنیادوں پر سوچنا شروع کیا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم ملک کا آدھا حصہ کھو بیٹھے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پانچ قومیتوں کا پرچار کرنے والے ایک خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں۔

لے جارہے تھے۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کی بھی وضاحت کر دی جائے کیونکہ یہ بات بڑی شد و مد سے کہی جارہی ہے کہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے دو قومی نظریہ کی تردید ہو جاتی ہے۔ پاکستان کی آئیڈیالوجی کے متعلق سادہ سے الفاظ میں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس سے یہ ہرگز مقصود نہیں کہ پاکستان میں اسلامی مملکت یا تھیاکریسی یا "پان۔ اسلامک" سیاسی نظام قائم کیا جائے۔ یہ چیز مسلمانوں کی ہندوؤں سے علیحدگی کا منطقی نتیجہ تو ہو سکتی ہے لیکن یہ اس آئیڈیالوجی کی بنیاد ہرگز نہیں۔ اس آئیڈیالوجی کی بنیاد "دو قومی نظریہ" ہے۔ سادہ الفاظ میں دو قومی نظریہ کا مفہوم یہ تھا کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں تھے انہیں ہندوستان سے الگ کر لیا جائے۔ بالفاظ دیگر مسلمان اقلیت کو ہندو اکثریت کے تغلب سے آزاد کرا لیا جائے۔ دو قومی نظریہ کے لئے پہلے ایک غیر قوم — یعنی ہندوؤں — کے وجود کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس کا اطلاق کسی اور مسلم قومیت پر نہیں ہو سکتا۔ بنابریں اگرچہ یہ کہنا ممکن یا مناسب نہ ہوگا لیکن ہوگا یہ بالکل منطقی اور جائز کہ ہندوؤں سے علیحدگی کے بعد ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق بلکہ جنوبی ہند میں مسلمانوں کی دو، تین یا پانچ مسلم ریاستیں ہو سکتی ہیں۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ

اگر پاکستان کی آئیڈیالوجی سے مراد ایک اسلامی مملکت کا قیام ہے جیسا کہ بعض لوگ نہایت شد و مد اور حتم و یقین کے ساتھ کہتے ہیں، تو پھر ہمیں یہ کہنا ہوگا کہ ہمیں کسی اور اسلامی مملکت، مثلاً افغانستان یا ایران کے اندر مدغم ہو جانا چاہیئے۔

میں ان طویل اقتباسات کے لئے سامعین سے معذرت خواہ ہوں۔ اگرچہ مقالہ نگار کا اسلوب بیان بڑا الجھا ہوا سا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں، سامعین اسے سمجھ گئے ہونگے۔

بنگلہ دیش کی علیحدگی کے سلسلہ میں وہ کہتے ہیں کہ مسلم لیگ کے ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن میں، پاکستان کے شمال جنوب اور شمال مشرق میں دو جداگانہ آزاد مملکتوں کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ اس لئے اگر مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو گیا ہے تو یہ

دو الگ الگ مملکتیں

قرارداد لاہور کے عین مطابق ہے۔ واضح رہے کہ دو آزاد مملکتوں کا یہ شوشہ پہلے مولانا بھاشانی نے چھوڑا تھا۔ پھر اسے شیخ مجیب الرحمٰن نے ابھارا۔ اور اب (بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی پیش بندی کے طور پر) اسے پھر بنیاد بنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ مرکزی وزیر (بلا شعبہ) مسٹر خورشید حسن میر نے بھی اگلے دنوں یہی کہا تھا۔ (ملاحظہ ہو طلوع اسلام۔ بابت جولائی ۷۲ء۔ صفحہ ۸)

یہ ہیں برادرانِ عزیز! وہ بھانت بھانت کی بولیاں جو اس وقت، نظریہ پاکستان اور دو قومی نظریہ کے متعلق یہاں بولی جا رہی ہیں۔ دو قومی نظریہ کے سلسلہ میں مجھے یہ بات انتہائی قلق اور تاسف کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ اس باب میں خود صدر مملکت، محترم بھٹو صاحب کا ذہن بھی صاف نہیں۔ چنانچہ انہوں نے گزشتہ مئی میں، امریکن براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ

ہم (اہلِ پاکستان اور اہلِ ہند) ۱۹۴۷ء تک ایک ہی قوم تھے۔ (پاکستان ٹائمز۔ ۱۵ مارچ)

یہ تو رہا دو قومی نظریہ کے متعلق۔ جہاں تک نظریہ پاکستان کا تعلق ہے گزشتہ جون میں پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں ہمارے محترم وزیرِ تعلیم ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے فرمایا کہ

وزیرِ تعلیم کا ارشادِ گرامی!

ہر کوئی نظریہ پاکستان کی بات تو کرتا ہے لیکن خود قائداعظمؒ نے نظریۂ پاکستان کا ذکر نہیں کیا۔ قائداعظمؒ نے مسلمانوں کے معاشی استحصال سے متاثر ہو کر پاکستان کے لئے جدوجہد شروع کی تھی اور مسلمانوں کی معاشی خوش حالی ان کا مقصد تھا۔

(نوائے وقت۔ ۲۴ جون)

اس پر حزبِ اختلاف کے لیڈر رحمت اللہ ارشد صاحب نے صدائے احتجاج بلند کی تو قائدِ ایوان محترم ملک معراج خالد نے یہ کہہ کر اس سوال کو موضوعِ بحث بننے سے روک دیا کہ:

ڈاکٹر صاحب کا مقصد یہ ہے کہ قائداعظمؒ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اور اسلام کو مقدم رکھ کر معاشی خوشحالی کی بات کرتے تھے۔ ان کے نظریات کی بنیاد اسلام تھا۔

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است!

ان حالات کے ماتحت عزیزانِ من! میں نے ضروری سمجھا ہے کہ کم از کم اتنا تو بتا دیا جائے کہ قائداعظمؒ اس باب میں کیا کہا کرتے تھے۔ مجھ پر یہ ذمہ داری ایک تو اس لئے عاید ہوتی ہے کہ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، پاکستان کا تحفظ میرا جزوِ ایمان ہے۔ اور دوسرے اس لئے کہ مجھے قریب دس سال تک قائداعظمؒ کے قریب رہنے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ کل روزِ قیامت اگر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تمہارے سامنے میرے خلاف اس قسم کے الزامات تراشے جاتے تھے، میں اپنی مدافعت کے لئے وہاں موجود نہیں تھا، تم ابھی زندہ تھے اور سب کچھ تمہارے علم میں بھی تھا، تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ حقیقتِ حال لوگوں پر واضح کر کے میری پوزیشن صاف کر دو، تو میں اُن کے اس سوال کا جواب کیا دوں گا؟ یہ ٹھیک ہے کہ ابھی ہم میں اُس دور سے متعلق ایسے لوگ موجود ہیں جو ان سوالات کا جواب مجھ سے بھی بہتر طریق پر دے سکتے تھے لیکن ان کی جو کیفیت ہے اسے بیان کرنے سے میری نگاہیں مارے شرم کے زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا،

مسلم لیگی راہ نمایانِ کرام

کوئی دو سال اُدھر کا ذکر ہے، پاکستان ٹیلیویژن نے، تحریکِ پاکستان میں حصہ لینے والے بعض نامور مشاہیر کو بلایا تھا کہ وہ بتائیں کہ مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ کیا تھا۔ اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے چوہدری خلیق الزمان، مسٹر حسین امام، راجہ محمود آباد، شاہ عزیز الرحمٰن جیسے بزرگ ٹیلیویژن پر تشریف لائے اور انہوں نے جو کچھ فرمایا مجھے یقین ہے کہ اسے سن کر قائداعظمؒ کی روح تڑپ اٹھی ہو گی۔ انہوں نے وہی کہا تھا جسے ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے اب دہرایا ہے۔ یعنی یہ کہ ہندو کی تنگ نظری نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ ہم اُس سے علیحدہ ہو جائیں۔ اگر وہ ذرا کشادہ دلی سے کام لیتا اور ہمارے معاشی استحصال سے باز آجاتا تو ہم کبھی الگ مملکت کا مطالبہ نہ کرتے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

زِ گلفروش منالم کہ اہلِ بازار است

تپاکِ گرمیٔ رفتار باغبانم سوخت

قائداعظمؒ کے ارشادات

لہٰذا عزیزانِ من! یہ قرعۂ فال اس دیوانے کے نام ہی پڑا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ قائداعظمؒ نے اس سلسلہ میں کیا کہا تھا یعنی اس سلسلہ میں کہ

(۱) کیا مطالبۂ پاکستان سے مقصود ایک اسلامی مملکت کا قیام تھا یا محض ہندو کے معاشی استحصال سے چھٹکارا حاصل کرنا۔

(۲) کیا دو قومی نظریہ اس لئے پیش کیا گیا تھا کہ یہ اسلام کا تقاضا ہے۔ یا اسے محض ایک حربہ کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ اور

(۳) قائداعظمؒ کے پیشِ نظر ایک پاکستان کا تصور تھا یا دو الگ الگ مملکتوں کا۔

اس سلسلہ میں میں ان زبانی باتوں کا تذکرہ بالکل نہیں کروں گا جو دس سال کی ملاقاتوں میں قائداعظمؒ کے ساتھ ہوتی رہیں۔ اس لئے کہ ان کی سند کوئی نہیں ہوگی۔ میں صرف قائداعظمؒ کی ان تقاریر اور بیانات کے اقتباسات پیش کروں گا، جو چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں بنیادی طور پر وہ دو جلدیں سرفہرست ہیں جنہیں شیخ محمد اشرف، پبلشر لاہور نے شائع کیا تھا۔ حوالے کے لئے جلد اول کا ۱۹۵۲ء کا اور جلد دوم کا ۱۹۴۶ء کا ایڈیشن میرے سامنے ہے (بفرضِ سہولت میں ان کے صفحات تک کا بھی حوالہ دیتا جاؤں گا)۔

(۰)

سب سے پہلے اس سوال کو لیجئے کہ قائداعظمؒ کی سیاست معاشی یا سیاسی مقاصد ہی پر مبنی تھی یا اس میں مذہب کو بھی کوئی دخل تھا۔ قائداعظمؒ کا حریفِ اوّل (مہاتما) گاندھی تھا۔ اس نے اعتراض کیا کہ مسٹر جناح خواہ مخواہ مذہب کو سیاست میں لگھسیٹ لاتے ہیں۔ مذہب کو سیاست سے کیا واسطہ؟ اس کے جواب میں قائداعظمؒ نے یکم جنوری ۱۹۴۶ء کو مسٹر گاندھی کے نام ایک تفصیلی خط لکھا اور اس میں کہا کہ:-

سیاست اور مذہب

آج آپ (یعنی مسٹر گاندھی) اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن جب خود آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے، وہ کون سی قوتِ محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح ہے۔ تو آپ نے کہا تھا کہ "وہ خالص مذہبی جذبہ ہے"۔ (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہو نہیں سکتے) آپ تمدنی۔ معاشی۔ سیاسی۔ اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسان کے معاملات سے واسطہ نہیں، میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔ (تقاریر۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۳۹)

میں سمجھتا ہوں کہ زیرِ نظر سوال کے جواب کے لئے صرف یہی اقتباس کافی ہوگا لیکن چونکہ بات اجمال سے نہیں بنے گی

اس لئے میں اس کی تفصیل بھی پیش کر دینا چاہتا ہوں۔

اسلام - اسلام اور صرف اسلام

(۱) قائداعظمؒ نے ۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء کو ریڈیو پر قوم کے نام پیغامِ عید نشر کیا تھا۔ اس میں انہوں نے قرآنی تعلیم کے مختلف گوشوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا تھا۔

معاشی احیاء ہو یا سیاسی آزادی۔ اسے آخرالامر زندگی کے کسی گہرے مفہوم پر مبنی ہونا چاہیئے اور مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیئے کہ ہمارے نزدیک زندگی کا وہ گہرا مفہوم اسلام اور روحِ اسلام ہے۔ (تقاریر جلد اول صفحہ ۱۰۸)

(۲) مارچ ۱۹۴۱ء میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کانفرنس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا کہ ذات برادری کی تقسیم اور شیعہ سنی کی تفریق ہمیں ایک قوم نہیں بننے دیگی۔ ان تفریقات کو ختم کر دیجیئے۔ یاد رکھیئے۔ ہماری کشتی کا لنگر اور ہماری عمارت کی بنیاد اسلام ہے۔ (تقاریر جلد دوم۔ صفحہ ۸۹)

(۳) انہوں نے ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹیر مسلم لیگ کانفرنس پشاور سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

(سوال یہ ہے کہ ہم جس آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اس کے حصول کے لئے ہمارے پاس قوت کونسی ہے) ہماری وہ قوت ہمارا مذہب، ہماری ثقافت اور اسلامک آئیڈیلز ہے۔ (تقاریر جلد دوم۔ صفحہ ۳۳۸)

(۴) انہوں نے ۱۹۴۵ء میں اپنے پیغامِ عید میں قوم سے کہا۔

یاد رکھیئے۔ اسلام صرف روحانی احکام اور نظریات یا مذہبی رسوم و مراسم کا نام نہیں۔ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو اسلامی معاشرہ کے ہر گوشے کو محیط ہے — خواہ اس کا تعلق انفرادی زندگی سے ہو اور خواہ حیاتِ اجتماعیہ سے۔ (تقاریر جلد دوم۔ صفحہ ۳۰۱)

یہ تو رہا اسلام کی عمومی حیثیت کے متعلق۔ اب آیئے اس سوال کی طرف کہ مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ کیا تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے

(۵) ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء کو فرنٹیر مسلم لیگ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

مسلمان اس لئے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مملکت میں وہ اپنے ضابطۂ زندگی اپنے ثقافتی نشوونما اور روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ (تقاریر حصہ دوم۔ صفحہ ۳۴۳)

(۶) اسی حقیقت کو انہوں نے اسی ماہ، اسلامیہ کالج پشاور کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے دہرایا۔ (ایضاً ۳۴۵)

(۷) انہوں نے ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈز کالج پشاور کے طلباء کے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

ہم ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہمارا مذہب ایک دوسرے سے مختلف ہے بلکہ ہمارا کلچر بھی الگ الگ ہے۔ ہمارا مذہب ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات عطا کرتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے آئیڈیلز کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں لیکن ہندو لیڈرشپ رام راج قائم کرنا چاہتی اور اس راج میں مسلمانوں کو اقلیت کی پوزیشن دینا چاہتی ہے (تقاریر حصہ دوم۔ صفحہ ۳۴۶)

آپ نے غور فرمایا عزیزانِ من! کہ یہ ہندو کا معاشی استحصال تھا جس نے ہمیں مطالبۂ پاکستان پر مجبور کیا تھا یا ان کا یہ منصوبہ کہ مسلمان اسلام کے مطابق نہیں بلکہ رام راج کے تابع زندگی بسر کریں! اس سلسلہ میں قائداعظمؒ نے:

(۸) پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ۱۸ مارچ ۱۹۴۷ء میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

اسلامک اسٹیٹ

پاکستان کا مطالبہ اب کروڑوں مسلمانوں کے نزدیک جزو ایمان بن چکا ہے یہ اب ایک نعرہ نہیں رہا۔ مسلمانوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی حفاظت، نجات اور مقدر کا واحد ذریعہ پاکستان ہے۔ وہ پاکستان کہ جب وہ وجود میں آگیا تو ساری دنیا میں یہ آواز گونج اٹھے گی کہ ہاں! اب ایک ایسی مسلم اسٹیٹ کا قیام عمل میں آگیا ہے جو اسلام کے ماضی کی درخشندہ عظمت و شوکت کا احیاء کریگی۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص۸۵)

(۹) یہاں قائداعظمؒ نے مملکتِ پاکستان کو وہ مسلم اسٹیٹ کہا ہے جو اسلام کے صدر اول کی عظمت و شوکت کا احیاء کریگی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ (دہلی) ۲۴ اپریل ۱۹۴۳ء کے خطاب میں انہوں نے فرمایا تھا۔

ہمارے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلائی جارہی ہیں۔ بہت سے فتنے برپا کئے جاتے ہیں۔ پوچھا یہ جاتا ہے کہ کیا پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہوگی؟ ان بھلے مانسوں سے کوئی پوچھے کہ کیا یہ بھی کوئی ایسی بات ہے جس کے متعلق کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش آئے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ایسا سوال کرنے والے ہمارے خلاف (VOTE OF CENSURE) پاس کرتے ہیں۔ (تقاریر۔ جلد اول۔ ص۵۵۵)

میں ضمناً یہاں یہ عرض کر دوں کہ یہ غلط فہمیاں جماعتِ اسلامی پھیلاتی تھی جس کے امیر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب فرماتے تھے کہ:

مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔

(سیاسی کشمکش حصہ سوم مطبوعہ ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۰ھ)

(۱۰) پاکستان کو اس قسم کی اسلامی مملکت بننا تھا جس کا تصور علامہ اقبالؒ نے دیا تھا۔ چنانچہ یوم اقبال منعقدہ دسمبر ۱۹۴۷ء کے سلسلہ میں پیغام دیتے ہوئے قائداعظمؒ نے فرمایا کہ

اسلامی نظریاتِ زندگی پر یقین محکم رکھتے ہوئے اقبال ان معدودے چند شاعروں میں سے تھا جنہوں نے اس امکان کو روشن کیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی حصوں میں جو مسلمانوں کے تاریخی اماکن ہیں، ایک اسلامک اسٹیٹ قائم کی جاسکتی ہے۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص۲۳۲)

(۱۱) قائداعظمؒ نے اس آواز کو کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی، ہندوستان کی چار دیواری تک ہی محدود نہیں رکھا۔ انہوں نے اسے مغربی ممالک تک میں عام کر دیا۔ انہوں نے ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایسوشی ایٹڈ پریس اوف امریکہ کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں بتایا۔

پاکستان ایک مسلم اسٹیٹ ہوگی۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص۳۲۶)

انہوں نے لندن میں مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے ۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کو فرمایا کہ

ہم ایک ایسی آزاد مملکت چاہتے ہیں جس میں ہم اپنے تصورات حیات کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔"

(تقاریر۔ حصہ دوم ص۴۰۳)

میں پوچھنا چاہتا ہوں برادرانِ گرامی قدر! کہ کیا ان اقتباسات کے بعد اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آسکتی

ہے کہ قائداعظمؒ کے نزدیک پاکستان کا مقصد کیا تھا اور وہ اسے ایک اسلامی مملکت دیکھنا چاہتے تھے یا سیکولر سٹیٹ!

اگر اسلام کو مٹنے سے بچانا چاہتے ہو تو ....

اگر ان کے اس قدر اعلانات بھی ناکافی ہوں تو ان میں دو ایک ایسے بیانات کا اضافہ کر لیجئے جن میں انہوں نے برملا کہہ دیا تھا کہ اگر تم اس حصۂ ارض پر اسلام کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس کے لئے قیامِ پاکستان کے سوا کوئی صورت ممکن نہیں۔ انہوں نے ـــــ

(۱۲) دس مارچ ۱۹۴۱ء کو مسلم یونیورسٹی یونین علیگڑھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :-

> اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اس کیلئے پاکستان نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین (GOAL) ہے۔ (تقاریر جلد اول ص۲۶۷)

(۱۳) پھر انہوں نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو پاکستان ڈے کی تقریب پر پیغام دیتے ہوئے کہا:-

> ہماری حفاظت نجات اور عزت و آبرو (کے تحفظ کا واحد ذریعہ) پاکستان ہے۔ (یاد رکھو) اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تباہ ہو جائیں گے اور پھر اس برصغیر میں مسلمانوں کا اور اسلام کا نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص۲۵۵)

(۱۴) اب آئیے اپنے اس راہ گم کردہ غلط بیں نوجوان کی طرف جس نے کہا تھا کہ مطالبۂ پاکستان کی اصلی بنیاد تو معاشی تھی

حصولِ پاکستان کے بعد

لیکن اسے مذہب کا نقاب اس لئے اوڑھا دیا گیا کہ یہ عوامی جدوجہد بن سکے! اس مفروضہ کے ماتحت اس نقاب کی ضرورت حصولِ پاکستان سے پہلے تک تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد تو اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ لیکن دیکھئے کہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی قائداعظمؒ کیا کہتے رہے تھے۔ انہوں نے آزادیٔ پاکستان کی پہلی سالگرہ کی تقریب پر ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو بحیثیت گورنر جنرل آف پاکستان قوم کے نام اپنے پیغام میں کہا تھا کہ

> پاکستان کا قیام ایک ایسا محیرالعقول واقعہ ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سٹیٹس میں سے ایک ہے۔ (گورنر جنرل کی حیثیت سے تقاریر کا مجموعہ ص۱۵۱)

یہ ان کی زندگی کا آخری پیغام تھا۔

(۱۵) انہوں نے گورنر جنرل کی حیثیت سے ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں خالقدینا ہال کراچی میں افسروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

> پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آچکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں اور اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جا سکیں۔ (ایضاً۔ ص۲۲۵)

اس مقام پر اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ جب قائدِ اعظمؒ پاکستان کو اسلامی مملکت قرار دیتے تھے

تھیاکریسی نہیں

تو وہ اس خطرہ سے بھی اچھی طرح آگاہ تھے جو اس مملکت کو اسلام کے اجارہ داروں کی طرف سے لاحق ہو سکتا تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بہت پہلے وارننگ دے دی تھی۔ ۱۱ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹرز کا کنونشن منعقد ہوا۔ اس کے آخری اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:۔

اسے اچھی طرح سمجھ لیجیئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے! یاد رکھیئے۔ ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک اسٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔ (تقاریر جلد دوم ص ۳۸۶)

انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہل امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا:۔

پاکستان کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیا ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عاید ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل ص ۶۵)

یہی بات انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو اہل آسٹریلیا کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہی تھی۔ (ایضاً ص ۵۸)

(۰)

قرآن عظیم

یہاں سے عزیزانِ من! ایک اہم سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ قائدِ اعظمؒ پاکستان کو اسلامی مملکت بھی بنانا چاہتے تھے اور اس کے ساتھ ہی اس میں زمامِ اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں بھی نہیں دینا چاہتے تھے۔ تو پھر وہ اس اسلامی مملکت میں قانون کا سرچشمہ اور آخری اتھارٹی کسے قرار دینا چاہتے تھے۔ قائدِ اعظمؒ نے اس باب میں بھی اپنے خیالات نہایت وضاحت سے بیان فرما دیئے تھے جو ہماری نئی نسل اور قدامت پرست دونوں طبقوں کے لئے دلیلِ راہ بننے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں غور سے سنیئے:۔

(۱) اپریل ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے، صوبہ سرحد کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائدِ اعظمؒ سے ایک پیغام کے لئے درخواست کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا۔

تم نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں۔ میں تمہیں کیا پیغام دوں جبکہ ہمارے پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہ نمائی اور بصیرت افروزی کے لئے کافی ہے۔ وہ پیغام ہے خدا کی کتاب عظیم قرآن کریم۔ (تقاریر۔ جلد اول۔ ص ۵۱۶)

(۲) ۱۳ نومبر ۱۹۴۱ء کو آپ نے قوم کے نام عید کا پیغام نشر فرمایا۔ اس زمانے میں ملک میں ہنگامے اور فسادات ہو رہے تھے۔ آپ نے قوم سے کہا کہ

جب ہمارے پاس قرآن کریم ایسی مشعلِ ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے۔ (تقاریر۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۰۸)

(۳) دسمبر ۱۹۴۳ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا۔

وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد خود ہی ان سوالات کا جواب ان الفاظ میں دیا:۔

وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتاب عظیم قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائینگے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔

ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول، فلہذا ایک قوم۔ (تقاریر۔ جلد دوم صفحہ ۵۰)

(۴) انہوں نے ۱۹۴۵ء میں ملت کے نام عید کے پیغام میں ایک ایسی حقیقت کشا بات کہی جس پر نگہ بصیرت ہمیشہ وجد کرتی رہے گی۔ آپ نے فرمایا:۔

اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں مشہور مورخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بحر اطلانتک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطہ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں۔ اور یہ قوانین غیر متبدل منشائے خداوندی کے مظہر ہیں"۔

اس کے بعد قائداعظمؒ فرماتے ہیں:۔

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطہ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا — ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ (انہیں الگ مذہبی پیشواؤں کی ضرورت ہی نہیں)۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۰۰)

یہ تھا وہ مکمل، غیر متبدل، ضابطہ جسے اس مملکت اسلامیہ کے لئے سرچشمہ قوانین و ہدایت قرار دیا جانا مقصود تھا

جامع ملخص

اسلامی مملکتِ پاکستانیہ کی اساس و ضوابط کے متعلق جو کچھ اس وقت تک کہا گیا ہے آپ یقیناً چاہتے ہونگے کہ میں ان کا جامع ملخص بھی آپ کے سامنے پیش کر دوں۔ لیکن حسنِ اتفاق دیکھئے کہ اس تفصیل کو خود قائد اعظمؒ نے دو تین سوالات کے جواب میں اس حسن و خوبی سے سمو دیا ہے کہ اس کے بعد اس باب میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہوا یہ کہ آپ اگست ۱۹۴۱ء میں حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے۔ وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء نے کچھ سوالات پوچھے۔ یہ سوالات' اور قائد اعظمؒ کی طرف سے دیئے گئے ان کے جواب' اورینٹ پریس آف انڈیا نے نشر کئے اور اس زمانے کے روزنامہ انقلاب (لاہور) نے شائع کئے۔ آپ بھی بغور سن لیجئے۔

<u>سوال</u>:۔ مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

<u>جواب</u>:۔ جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو اُس زبان اور محاورے کی رُو سے میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ مُلاّ۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوٰے ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریقِ عمل نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے' اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔

<u>سوال</u>:۔ اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

<u>جواب</u>:۔ اشتراکیت' یا بالشویت یا اسی قسم کے دیگر معاشی یا سیاسی مسالک درحقیقت اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی شکلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط و تناسب نہیں پایا جاتا۔

اب دیکھئے وہ تیسرا سوال اور اس کا جواب جو ہمارے نزدیک اس نظم مرصع کا مقطع کا بند ہے۔ سوال یہ تھا کہ،

اسلامی حکومت کے تصور کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟

<u>جواب</u>:۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ' قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن حکیم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت' دوسرے الفاظ میں' قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اور یہ ہے عزیزانِ من! — **نظریۂ پاکستان۔**

یہ تھے قائد اعظمؒ کے ارشادات اس باب میں کہ پاکستان کی مملکت کس قسم کی ہوگی۔ ان کی موجودگی میں مودودی صاحب' تقسیم سے پہلے فرماتے تھے کہ لیگ کے کسی لیڈر نے آج تک نہیں کہا کہ پاکستان میں نظامِ حکومت اسلامی ہوگا اور جسٹس منیر صاحب' تشکیلِ پاکستان کے بعد فرماتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان کے زمانے میں کسی کے ذہن تک میں نہیں تھا کہ یہاں اسلامی حکومت

قائم ہوگی۔ نہ ہی انہیں اس کا علم تھا اور نہ ہی ہمارے وزیرِ تعلیم کو اس کا علم کہ قائدِ اعظمؒ نے کبھی اسلام کا نام لیا تھا یا نہیں۔ انہیں تو اس کا علم نہیں تھا لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کا علم تھا تو کسے تھا؟ اسے بھی غور سے سنیے۔ یکم نومبر ۱۹۴۱ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور راہنما مسٹر منشی (آنجہانی) نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:۔

> تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے اماکن بنالیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکیں اور جہاں اردو انکی قومی زبان بن سکے۔ مختلف الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ (ٹریبیون۔ ۲ نومبر ۱۹۴۱ء)

(۲) ۱۹۴۰ء میں ایک دفعہ یہ تجویز زیرِ غور آئی کہ کانگریس اور مسلم لیگ مل کر مخلوط حکومتیں قائم کرلیں۔ اس پر کانگریس کے ایک بلند پایہ لیڈر، مسٹر ستیہ مورتی نے کہا کہ

> کانگریس اس مسلم لیگ کیساتھ مل کر مخلوط حکومتیں کس طرح قائم کر سکتی ہے جس کا نصب العین اسلامی حکومت کا احیاء ہو۔ (ہندوستان ٹائمز۔ جون ۱۱)

یہ قرارداد لاہور کے تین ہی ماہ بعد کی بات ہے۔

آپ نے غور فرمایا؟ برادرانِ عزیز! اس حقیقت کو نہ مودودی صاحب جانتے تھے نہ جسٹس منیر صاحب۔ نہ ہمارے وزیرِ تعلیم جانتے تھے، نہ حامد محمود صاحب۔ اسے جانتا تھا تو ہندوستان کا ہر ہندو۔ سچ کہا تھا میر تقی میر نے کہ

پتّہ پتّہ، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

——— (۰) ———

ایک مملکت

اس مقام پر یہ بھی دیکھتے جائیے کہ قائدِ اعظمؒ نے پاکستان کے مغربی اور مشرقی بازوؤں میں دو الگ الگ آزاد ریاستوں کا تصور دیا تھا یا انہیں ایک ہی مملکت کے دو اجزاء کے لاینفک قرار دیا تھا۔ انہوں نے ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ:۔

> جغرافیائی حیثیت سے پاکستان مغرب میں صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ اور پنجاب پر مشتمل ہوگا۔ اور مشرق میں بنگال اور آسام اس کا دوسرا حصہ ہونگے۔ پاکستان کے ان اجزاء کو اس کے صوبے یا (STATES) کہہ لیجیے۔ پاکستان بہرحال ایک مسلم اسٹیٹ ہوگا۔ (تقاریر، جلد دوم، ص ۲۶-۳۲۵)

(۳) انہوں نے ۲۲ مئی ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن پلان کے سلسلے میں بیان دیتے ہوئے کہا:۔

> مسلم لیگ کی پوزیشن یہ ہے کہ مشرق میں بنگال اور آسام اور مغرب میں پنجاب۔ سرحد، سندھ

اور بلوچستان مل کر ایک آزاد، خود مختار مملکت بنیں گے۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۹)

(۳) انہوں نے ۱۴؍ دسمبر ۱۹۴۶ء کو لندن میں اعلان کیا تھا کہ "ہم ایک آزاد مملکت چاہتے ہیں"۔ (تقاریر جلد دوم صفحہ ۴۳)

(۴) تشکیلِ پاکستان کے بعد وہ اس مملکت کے گورنر جنرل بنے جو مشرقی اور مغربی دونوں حصوں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے ۱۹؍ فروری ۱۹۴۸ء کو باشندگانِ آسٹریلیا کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا کہ

> پاکستان دو قطعات (BLOCKS) پر مشتمل ہے۔ ایک شمال مغرب میں واقع ہے اور دوسرا شمال مشرق میں۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ صفحہ ۵۷)

(۵) پھر انہوں نے اسی ماہ اہلِ امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں فرمایا۔

> پاکستان جو دس کروڑ مسلمانوں کے حسین خوابوں کی محسوس تعبیر ہے ۱۵؍ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آگیا۔ یہ دنیا میں سب سے بڑی اسلامی مملکت اور تمام دنیا کی مملکتوں میں پانچویں درجہ پر ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک مغربی پاکستان اور دوسرا مشرقی پاکستان۔ ان دونوں میں قریب ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ مغربی پاکستان سرحد، مغربی پنجاب، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہے جس کا رقبہ (۱,۷۹,۰۰۰) مربع میل ہے اور مشرقی پاکستان مشرقی بنگال اور ضلع سلہٹ پر مشتمل۔ اس کا رقبہ (۵۴,۰۰۰) مربع میل ہے۔ پاکستان کا کل رقبہ (۲,۳۳,۰۰۰) مربع میل اور آبادی قریب سات کروڑ ہے۔ (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل۔ صفحہ ۶۳)

فرمائیے! ان شواہد کے بعد یہ سمجھنے کے لئے کسی اور دلیل کی بھی ضرورت ہے کہ قائد اعظمؒ کے نزدیک پاکستان سے مراد ایک آزاد مملکت تھی، یا مشرق اور مغرب میں دو آزاد مملکتیں!

دو قومی نظریہ

اب میں عزیزانِ من! اس سوال کے تیسرے، اور بنیادی حصہ کی طرف آتا ہوں۔ یعنی دو قومی نظریہ کی طرف۔ اس ضمن میں سب سے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ "دو قومی نظریہ" سے مراد اتنی ہی نہیں کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو قومیں بنتی تھیں۔ "دو قومی نظریہ" اسلام کی بنیادی تعلیم اور ایک ابدی صداقت ہے جس کا اعلان اس دن ہوا جب خدا کے پہلے رسول حضرت نوحؑ نے سب سے پہلی مرتبہ دینِ خداوندی کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد ہر رسول اس صداقت کو دہراتا رہا تاآنکہ اسے قرآن کریم کی دفتین میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ وہ ابدی صداقت یہ ہے کہ ساری دنیا کے انسان، دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک گروہ وہ جو وحیٔ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے (اور یہ وحی اب صرف قرآن مجید کے اندر محفوظ ہے) اور دوسرا گروہ وہ جو اس نہج زندگی کو تسلیم نہیں کرتا۔ قرآن کریم کے الفاظ میں۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ۔ (۶۴/۲)

ایک ابدی صداقت

"خدا وہ ہے جس نے تم سب انسانوں کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے کچھ کافر ہو گئے اور کچھ مومن بن گئے"۔ لہٰذا، قرآن کریم کی رُو سے دنیا میں قومیں دو ہی ہیں۔ ایک وہ قوم جو اس ایمان کی رُو سے وجود میں

آئے اور دوسری ان کی جو ان میں شامل نہ ہوں۔ اس سے واضح ہے کہ جس طرح یہ تصور اسلام کے خلاف ہے کہ مسلم اور غیر مسلم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں، اسی طرح یہ مسلک بھی یکسر خلافِ اسلام ہے کہ مسلمان، رنگ، نسل، زبان، اور وطن کے اختلاف سے مختلف قوموں میں بٹ سکتے ہیں

صدرِ اول میں اسی نظریہ کی بنا پر دو قوموں کا وجود عمل میں لایا گیا ــ ایک امتِ مسلمہ (یعنی تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم) اور دوسری ملتِ کافریہ ــ لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب مسلمانوں کی گاڑی اسلام کو چھوڑ کر دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو امتِ مسلمہ (یعنی مسلمان قوم)، رنگ، نسل، زبان اور وطن کے اختلاف سے الگ الگ قوموں میں بٹ گئی۔ اور ان کی مملکتیں بھی الگ الگ قائم ہوگئیں۔ مسلمانوں کو اس غیر اسلامی نہج زندگی پر صدیاں گذر گئیں تا آنکہ علامہ اقبالؒ نے صدرِ اول کے صحیح اسلام کا تصور مسلمانوں کے سامنے پیش کیا، اور چاہا کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل ہو جائے جس میں اس تصور کو عملاً متشکل کر کے احیاءِ اسلام کی تحریک کا آغاز کر دیا جائے۔ اس تجربہ کے بعد یہ سلسلہ آگے پھیلتا جائے جس سے

عالمگیر امت اور مملکت

رفتہ رفتہ تمام دنیا کے مسلمان پھر سے امتِ واحدہ (ایک قوم) بن جائے اور ان کی ایک مرکزی قوت قائم ہو جائے جس کا نقطۂ ماسکہ قرآن کریم ہو۔ حامد محمود صاحب نے جو کہا ہے کہ اگر ایمان کے اشتراک کی بنا پر قومیت کی تشکیل کا اصول صحیح ہے تو پھر پاکستان کو کسی اسلامی مملکت (مثلاً افغانستان۔ ایران) کے ساتھ مدغم ہو جانا چاہیئے تو یہ بات اپنی اصل کی رُو سے بالکل درست ہے لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ (اول تو) پاکستان کو حقیقی اسلام کی تجربہ گاہ بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ یہ ابھی تک اسلامی مملکت نہیں بن سکا۔ اور دوسرے یہ کہ اِس وقت دنیا میں اسلامی مملکت کوئی بھی نہیں۔ سب مسلمانوں کی قومی مملکتیں ہیں۔ مسلمانوں کی مملکتیں اگر (اور جب) اسلامی بن جائیں گی تو ان کے رہنے والے مسلمان سب ایک قوم کے افراد ہوں گے اور ان مملکتوں کا ضابطۂ قوانین و سرچشمۂ آئین بھی ایک ہی (یعنی قرآنِ کریم) ہوگا ــ اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تمام مملکتیں ایک ہی مملکت میں مدغم ہو جائیں۔ موجودہ زمانے میں جب سلسلۂ مواصلات اس قدر عام اور سامانِ رسل و رسائل ایسا بافراط ہو گیا ہے اس قسم کی عالمگیر مملکت کا قیام کچھ بھی مشکل نہیں رہا۔

یہ بہرحال بعد کی بات ہے۔ ہم نے اس تجربہ کی ابتدا کرنے کے لئے، پاکستان کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اس سلسلہ میں ہمارا پہلا مطالبہ "مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کی تشکیل نہیں تھا بلکہ اس حقیقت کا تسلیم کرانا تھا کہ مسلمان" ایمان کے اشتراک کی بنا پر، ہندوستان کے غیر مسلموں سے الگ "مستقل بالذات" قوم ہیں۔ قائداعظمؒ سے اس کی بابت پوچھا جاتا تو وہ فرماتے کہ اگر مسلمانوں کو ایک جداگانہ قوم تسلیم کرا لیا گیا تو ان کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا قیام اس کا منطقی اور لازمی نتیجہ ہوگا۔ اس لئے ہمیں سب سے پہلے اس بنیادی مطالبہ پر زور دینا چاہیئے۔ خود رسول اللہ نے بھی پہلے ایک (جداگانہ) امت کی تشکیل فرمائی تھی۔ مملکت اس کے پیچھے پیچھے خود آگئی تھی۔ آیئے اب ہم دیکھیں کہ قائداعظمؒ اس مطالبہ کو کس طرح باصرار و تکرار پیش کرتے گئے تھے۔

(۱) قائداعظمؒ نے اس مطالبہ کا آغاز ایک ایسی حقیقت سے کیا، اور اسے ایسے انداز میں پیش کیا جو جامعیت

مذہب کی بنیاد پر دو قومیں

کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

پاکستان کا آغاز تو اس دن ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم اسلام قبول کر کے مسلمان ہوا تھا۔ حالانکہ اس وقت ہنوز مسلمانوں کی کوئی حکومت یہاں قائم نہیں ہوئی تھی۔ جونہی کوئی ہندو مسلمان ہوتا ہندو اسے مذہباً ہی نہیں بلکہ معاشرتی، ثقافتی اور اقتصادی حیثیت سے بھی اپنی برادری سے خارج کر دیتے (اور اس طرح اس کی پہلی قومیت ختم ہو جاتی) جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اسلام نے ان پر یہ پابندی عاید کر رکھی تھی کہ وہ کسی دوسری قومیت میں مدغم نہیں ہو سکتے۔ (اس طرح یہاں دو قومیں وجود میں آتی چلی گئیں) یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی قصبہ اور ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود کبھی ایک قوم میں مدغم نہیں ہو سکتے۔ وہ ہمیشہ دو الگ الگ قوموں کی حیثیت سے رہتے چلے آ رہے ہیں۔ (تقاریر۔ حصہ دوم۔ ص۱۱۴)

یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان کبھی ایک قوم میں مدغم نہیں ہوئے۔ ایک قوم میں مدغم ہونا تو ایک طرف ہندوؤں نے ہمیشہ مسلمانوں کو اچھوت سمجھا (اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا وہ گروہ جس نے ہندوؤں میں اس خیال کو عقیدہ کی حیثیت سے ابھارا کہ مسلمان اچھوت ہیں، بڑی دور رس اور گہری سیاسی نگاہ رکھتا تھا۔ اس سے ہندو اپنا جداگانہ تشخص قائم رکھ سکے) مسٹر گاندھی اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے کہ ہندو اور مسلمان نہ کبھی ایک قوم بنے ہیں، نہ بن سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ قائداعظمؒ کے اس مطالبہ کی مخالفت میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگاتے رہے۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ جونہی مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کو تسلیم کیا گیا، ان کے لئے جداگانہ مملکت کا قیام ناگزیر ہو جائے گا۔ آپ دیکھئے کہ وہ قائداعظمؒ کے اس دعوے پر کہ مسلمان بربنائے مذہب ایک جداگانہ قوم کے افراد ہیں، کس طرح تلملا اٹھے تھے۔ انہوں نے (مسٹر گاندھی نے) ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کو قائداعظمؒ کے نام اپنے خط میں لکھا:-

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباء و اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آباء و اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

(۲) پاکستان کا ریزولیوشن مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء میں پاس ہوا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت کے دوران قائداعظمؒ نے فرمایا:-

میرے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اصلیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھیئے! ہندو اور مسلمان زندگی کے ہر معاملہ میں جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کا ایک نظامِ حکومت میں جکڑ دینا باہمی منافقت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دیگا جو اس ملک کے لئے وضع

کیا گیا ہو۔ (تقاریر۔ جلد اول۔ ص ۱۷۷-۱۷۸)

(۳) انہوں نے ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈس کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ایسا ضابطہ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص ۳۴۶)

(۴) انہوں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۴۵ء کو احمد آباد میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم میں اور ہندوؤں میں کوئی بھی تو قدر مشترک نہیں۔ مذہب کو چھوڑیئے۔ ہم میں معاشرتی اور ثقافتی زندگی میں بھی کوئی اشتراک نہیں۔" پھر انہوں نے پاکستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس منعقدہ ۲ مارچ ۱۹۴۶ء میں اسی حقیقت کو دہرایا۔ (تقاریر جلد اول۔ ص ۲۵۴ و ۲۳۹)۔ انہوں نے ۱۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کو لندن میں کہا کہ:۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات اس قدر بنیادی ہیں کہ زندگی کا کوئی مسئلہ بھی تو ایسا نہیں جس میں ہم دونوں متفق ہوں۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ ص ۵۳۰)

(۵) انہوں نے مسلم لیگ کے مدراس سیشن (۱۹۴۱ء) کے خطبۂ صدارت میں فرمایا:۔

مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش کی جائے گی اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا..... ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہم نے اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ مملکت کو قائم کر کے رہنا ہے۔ اس باب میں کسی کو کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے۔ (تقاریر جلد اول ص ۲۸۰)

(۶) اور اسی جداگانہ قومیت کے دعویٰ کی بنا پر انہوں نے جداگانہ مملکت کا مطالبہ پیش کر دیا۔ انہوں نے مسلم لیگ کے

الگ قوم، الگ مملکت

۱۹۴۰ء کے اجلاس میں یہ کہہ کر اس کی بنیاد رکھ دی تھی کہ "مسلمان قومیت کی ہر تعریف کی رُو سے ایک الگ قوم ہیں اور اس لئے ان کے بسنے کی جگہ بھی الگ ہونی چاہیئے۔ (تقاریر۔ جلد اول۔ ص ۱۸۰) پھر انہوں نے ۲ مارچ ۱۹۴۱ء کو پاکستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہم اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں اور ایک قوم کے لئے لامحالہ ایک الگ علاقہ چاہیئے۔ اگر قوم کا اپنا علاقہ (TERRITORY) نہ ہو تو اس کے قوم۔ قوم پکارنے کا فائدہ کیا ہے۔ ایک قوم خلا میں تو نہیں رہ سکتی۔ وہ ہوا میں نہیں بلکہ زمین پر رہتی ہے۔ اسے زمین پر حکومت کرنی چاہیئے۔ اس لئے اس کی اپنی مملکت ہونی چاہیئے۔

اور یہی ہمارا مطالبہ ہے۔ (تقاریر۔ جلد اول۔ ص ۴۷۲)

اسی حقیقت کو انہوں نے یکم فروری ۱۹۴۳ء کو اسماعیلی کالج بمبئی میں اپنی تقریر کے دوران دہرایا۔ (ایضاً۔ ص ۵۱۳)

میں نے عزیزانِ من! پہلے بتایا ہے کہ یہ حقیقت کہ پاکستان کا مطالبہ اسلام کے نام پر کیا جا رہا ہے اور اس مملکت کی حکومت قرآن پر مبنی اسلامی ہوگی مخالفین تحریکِ پاکستان (نیشنلسٹ علماء اور جماعتِ اسلامی، احرار خدائی خدمتگار وغیرہ) کی سمجھ میں تو نہیں آتی تھی لیکن ہندو اسے خوب سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں میں نے مسٹر منشی کے خطبۂ صدارت اور مسٹر ستیہ مورتی کے بیان کا اقتباس بھی پیش کیا تھا۔ یہی صورت "دو قومی نظریہ" کی بھی تھی۔ اسے نہ مولانا حسین احمد مدنی سمجھتے تھے نہ ابو الکلام آزاد۔ لیکن اسے ہندوؤں کے لیڈر خوب سمجھتے تھے۔

لالہ لاجپت رائے کا اعتراف

لالہ لاجپت رائے ایک کٹر ہندو لیڈر اور نظریۂ پاکستان کا شدید ترین دشمن تھا۔ اس نے کانگریسی راہنما، مسٹر سی۔ آر۔ داس کو ایک خط لکھا تھا جس کا حوالہ قائد اعظمؒ نے مسلم لیگ سیشن ۱۹۴۰ء کے خطبۂ صدارت میں دیا تھا۔ اس خط میں لالہ لاجپت رائے نے لکھا تھا:-

> ایک اور بات جو کچھ عرصہ سے میرے لئے وجہ اضطراب بن رہی ہے ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس پر دعوتِ غور و خوض دوں۔ گزشتہ چھ ماہ میں میں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور اس سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ چیز (ہندو مسلم اتحاد) ایک امرِ محال اور ناقابلِ عمل شے ہے۔ وہ مسلمان راہنما جو عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہیں، اگر ان کے خلوصِ نیت کو تسلیم بھی کر لیا جائے، تو بھی میرے خیال میں ان کا مذہب اس کے راستے میں زبردست رکاوٹ ثابت ہوگا۔

اس کے بعد انہوں نے لکھا تھا۔

> آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے کلکتہ میں اپنی اس گفتگو کا، جو اس باب میں حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر کچلو سے ہوئی تھی، آپ سے تذکرہ کیا تھا۔ ہندوستان میں حکیم صاحب سے زیادہ سلجھا ہوا کوئی مسلمان نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حکیم صاحب یا کوئی دوسرا مسلمان راہنما قرآن کریم کے احکام پر خطِ تنسیخ کھینچ سکتا ہے ...... میں تہ دل سے ہندو مسلمان اتحاد کی ضرورت کا قائل ہوں۔ اس کے لئے میں مسلمان راہنماؤں پر اعتماد کرنے کو بھی تیار ہوں لیکن قرآن و حدیث کے احکام کو ہم کیا کریں گے۔ مسلمان راہنما ان پر تو خطِ تنسیخ نہیں کھینچ سکتے۔
>
> (تقاریر جلد اول، صفحہ ۱۷۰-۱۷۱)

کیا اس کے بعد بھی برادرانِ عزیز! اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی شبہ رہ سکتا ہے کہ دو قومی نظریہ جسے قائد اعظمؒ اس شد و مد سے پیش کرتے چلے آ رہے تھے، قرآن و حدیث کے احکام پر مبنی تھا — قرآن و حدیث کے ان احکام پر جن پر بقول لالہ لاجپت رائے کوئی مسلمان خطِ تنسیخ کھینچ نہیں سکتا۔

(۰)

کہا یہ جاتا ہے کہ قائد اعظمؒ نے بیشک دو قومی نظریہ ہندوستان میں پیش کیا تھا لیکن انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد ۱۱ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی اسمبلی کی تقاریر میں کہہ دیا تھا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم ایک ہو کر رہیں گے۔ اور

تشکیلِ پاکستان کے بعد

اس طرح انہوں نے دو قومی نظریہ پر خود ہی خطِ تنسیخ کھینچ دیا تھا! اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ میں اس وقت اس کی تفصیل

میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اس وقت (میں سمجھتا ہوں کہ) اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ قائداعظمؒ کی ان تقاریر کا مطلب ایک غیر مسلم نے کیا سمجھا تھا۔ مسٹر جوشوا فضل دین مشہور عیسائی راہنما ہیں۔ انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا۔ جس کا عنوان تھا (RATIONALE OF PAKISTAN'S CONSTITUTION) اس میں انہوں نے، قائداعظمؒ کی مذکورہ بالا تقاریر کے اقتباسات دینے کے بعد کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان سے قائداعظمؒ کا یہ مقصد تھا کہ یہاں نہ ہندو ہندو رہے نہ مسلمان مسلمان، بلکہ ان کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم متشکل ہو جس کا نتیجہ لازماً سیکولر انداز حکومت ہو جائے، وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ایسے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

> یہ کہنا کہ تخلیق پاکستان کے بعد قائداعظمؒ نے۔ جو خود پاکستان کے خالق تھے۔ اپنی پہلی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دور کا بھی امکان ہو کہ پاکستان کی بنیادیں منہدم ہو جائیں گی، بالکل پاگل پن ہے۔

اور کس قدر دوررس نگاہ تھی قائداعظمؒ کی! انہوں نے جاتے جاتے، ایک بار پھر واضح کر دیا کہ اسلامی قومیت کے بنیادی عناصر کیا ہوتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈکاسٹ میں پہلے یہ فرمایا۔

> مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان سے قریب ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہے اور ان کے درمیان مملکتِ ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرونی ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال ابھرتا ہوگا وہ یہ ہوگا کہ (ایسی مملکت کا قیام) کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں جن میں اس قدر بُعد ہو، وحدتِ حکومت کس طرح ممکن ہوگی۔ میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا۔ اور وہ یہ کہ:-
>
> ایسا ہمارے ایمان کی رُو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر۔ ایمان اپنے آپ پر۔ ایمان اپنے مستقبل پر۔
>
> لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ ایسے مختصر سے جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہیں سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کر دوں۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا:-

> پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جس میں حقوق، شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنا بریں، ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات۔ ہم اپنے نظریاتِ زندگی، نقطۂ نگاہ اور احساسات کے مالک ہیں۔ اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔ (ان بنیادوں پر ہم ایک قوم بنتے ہیں)
>
> (تقاریر بحیثیت گورنر جنرل ص۵۸)

آخری وضاحت

ایمان۔ ایمان خدا پر۔ ایمان اپنے آپ پر۔ ایمان اپنے مستقبل پر۔

یہ تھی برادرانِ عزیز! وہ اساسِ محکم جس پر مملکتِ پاکستان کی یہ رفیع و عظیم عمارت استوار ہوئی تھی۔ اور آج وہی ایمان باقی نہیں رہا۔ اور اسی کے باقی نہ رہنے سے ایک حصہ پاکستان ختم ہو چکا ہے اور دوسرے کی بقا کے لئے ہم دعائیں مانگ رہے ہیں۔

(۲)

ہماری تباہی کے حقیقی اسباب

مشرقی پاکستان کی علیحدگی نہ تو کوئی اتفاقی یا ہنگامی حادثہ ہے اور نہ ہی (جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے) اس کے حقیقی ذمہ دار شیخ مجیب یا یحییٰ خان وغیرہ ہیں مجیب اور یحییٰ خان یا اکہتر (۱۹۷۱ء) کے حادثات تو اس کے فوری اسباب (IMMEDIATE- CAUSES) ہیں۔ اس کی ابتدا قائد اعظمؒ کی وفات کے فوری بعد ہو گئی تھی جب (جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں) پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ملا کر اشتراکِ وطنیت کی بنا پر ایک قوم تسلیم کر لیا گیا اور اس طرح پاکستان کے دو ستونوں میں سے ایک کو خود ہی منہدم کر دیا۔ اس وقت سندھ اور مشرقی پاکستان میں ہندو خاصی تعداد میں تھے۔ اور اگرچہ گنتی کے اعتبار سے اقلیت میں تھے لیکن تعلیمی اور اقتصادی شعبوں میں وہ مسلمانوں پر غالب تھے۔ ان کے ایک قوم تسلیم کر لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ان علاقوں پر عملاً چھا گئے۔

ازاں بعد اردو اور بنگلہ دونوں قومی زبانیں تسلیم کر لی گئیں اور یوں بنگالیوں کے علیحدہ تشخص کی بنیاد رکھ دی گئی۔ ہندوؤں کے زیر اثر تعلیم سے وہاں (اور سندھ میں) سیکولر حکومت کا تصور پھیلتا چلا گیا۔ اور جب اسلام بنائے مملکت نہ رہا تو نسل اور زبان کے اشتراک کی بنا پر بنگالیوں میں جداگانہ قومیت کا رجحان تیز تر ہوتا گیا۔ چوبیس سال سے یہ تخریبی عوامل پرورش پاتے رہے اور اربابِ اقتدار میں سے کسی نے بھی نہ تو ان کے سدِباب کی کوئی فکر کی، اور نہ ہی مثبت طور پر اسلام کی بنیاد پر واحد قومیت کی تعمیر کے لئے کوئی عملی اقدام کیا۔ اگرچہ زبانی ہر ایک یہی کہتا رہا کہ اسلام ہی وہ رشتہ ہے جس کی وجہ سے ہم اور ہزار میل دور بنگالی مسلمان ایک قوم کے افراد ہیں۔ اب نہیں کہہ سکتا کہ یہ زبانی دعاوی اور اعلانات خود فریبی تھا یا خدا فریبی۔ لیکن تھا بہرحال فریب ہی فریب۔ یہ تھے وہ عوامل جو آہستہ آہستہ نشو و نما پانے کے بعد مشرقی بنگال کی علیحدگی کا موجب بنے —— یہ اس کے بنیادی اسباب تھے۔ باقی سب ہنگامی اسباب۔

مشرقی پاکستان کے ہاتھوں سے چھن جانے کے بعد اب وہی عوامل یہاں بھی تیزی سے بڑھنے شروع ہو گئے ہیں۔ اور یہ اسی سازش کی بڑھتی ہوئی شاخ ہے جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر منتج ہوئی تھی۔ اس کے لئے ہمارے پاس شواہد موجود ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ہندو اثر کے ماتحت وہاں کے مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ذہنی کیفیت کیا ہو چکی تھی، اس کا اندازہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایم۔ اے کے طالب علم عزیز الرحمٰن کے اس خط سے لگ سکتا ہے جو اس نے ۱۹۶۹ء میں لکھا تھا اور جو طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں اس نے کہا تھا کہ پاکستان بننے کا نتیجہ تھا کہ:-

مشرقی پاکستان کی بے باکیاں

ہم شری چیتنیا، خودی رام، سبھاش بوس، بھائی سنگھ جیسے اپنے قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے تھے اور ان کی جگہ خالدؓ۔ طارق۔ موسے اور علی مجیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے تھے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان

کو بھلا دیا تھا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا — اللہ کو اپنا معبود تصور کر لیا تھا۔ اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بندھن ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہو جائیں گے۔

اس کے بعد اس نے لکھا تھا کہ:

مشرقی بنگال کی اس روش کے تتبع میں مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی بھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ اس کے بعد ڈھاکہ سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار (FORUM) نے اپنی ۳۰ جنوری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

دسمبر ۱۹۷۰ء تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ اہل پاکستان میں وجہ جامعیت مذہب ہے۔ انتخابات نے اس ملمع کی قلعی کھول دی...... اور نظریہ پاکستان کی وہ تمام نگاہ فریب خوش نمائیاں جنہیں قدامت پسند اور استحصال پسند طبقہ اس شد و مد سے پیش کرتا تھا، افسانہ بن کر رہ گئیں۔

اس کے بعد اس نے اپنی ۲۷ فروری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ:

جب اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ مشرقی اور مغربی پاکستان کو متحد نہیں رکھ سکے تو پھر سوچئے کہ بلوچ، پٹھان، پنجابیوں کو کون سا رشتہ متحد رکھ سکے گا۔ اسلام کی یاد تو یقیناً ایسا نہیں کر سکے گی۔

یہ خیالات عام ہوئے تو جیسا کہ عزیز الرحمٰن نے کہا تھا، ادھر سے سب سے پہلے ان کی نمود سندھ سے ہوئی۔ چنانچہ کراچی سے شائع

اب سندھ میں

ہونے والے روزنامہ حریت کی ہفتہ وار اشاعت بابت ۱۲ نومبر ۱۹۷۰ء میں ایک سندھی طالبہ مس نسیم تھل کا ایک خط چھپا تھا جس میں اس نے لکھا تھا۔

وہ اسلام اور پاکستان جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے، ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت، سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہن جو داڑو، کوٹ ڈیجی کے آثار قدیمہ اور لطیف، سچل، ایاز، جی ایم سید کی طرح کے شاعروں، دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔

اور یہی وہ ایاز اور سید ہیں جو اسلام کے خلاف وہ کچھ لکھتے اور کہتے ہیں جو اس کے بدترین غیر مسلم دشمنوں نے بھی نہیں کہا تھا۔ اور اب یہ اس تحریک کے کارواں سالار ہیں جس کا مطمح نگاہ سندھ کی آزادی اور علیحدگی ہے۔ یہی خیالات اب رفتہ رفتہ مغربی پاکستان کے دوسرے علاقوں — سرحد اور بلوچستان — میں بھی پھیل رہے ہیں۔ یہاں بھی اسلام کے بنائے قومیت ہونے کے بجائے اب کھلم کھلا نسل یا زبان کے اشتراک کو قومیت کی بنیاد قرار دیا جا رہا ہے۔ اس بنیاد پر پہلے یہاں چار قوموں کے وجود کا تصور عام کیا جا رہا تھا؛ اب ان میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا ہے — یعنی اردو بولنے والے مہاجر۔ اس کے بعد مملکت کے دوسرے ستون — یعنی اسلامی مملکت کے اصول کی طرف آیئے تو ہمارے غلط نظام تعلیم کی وجہ سے سیکولر حکومت کا تصور ہمارے سکولوں اور کالجوں میں پہلے ہی عام ہو رہا تھا، جو اس کے بعد ہماری سیاسی پارٹیوں کے

منشور میں بھی یہ شق داخل ہونا شروع ہو گئی ـــــ ذرا غور فرمائیے اس پر بھی کہ آئین پاکستان میں یہ لکھا جاتا ہے کہ مملکت اسلامی ہوگی اور سیاسی پارٹیاں اپنے منشور میں کہتی ہیں کہ مملکت سیکولر ہوگی۔ اور ان کے خلاف' اس بنا پر کوئی ایکشن نہیں لیا جاتا۔ حالانکہ زندہ قوموں کے ہاں اس قسم کا تضاد مملکت سے بغاوت قرار دیا جاتا ہے۔

ذرا سوچئے کہ مغربی پاکستان میں نسل یا زبان کے اعتبار سے چار (یا پانچ) الگ قومیں اور حکومت سیکولر! پھر یہ تصور کہ قومی زبان بے شک ایک (اردو) ہوگی لیکن سرکاری زبان ہر صوبے کی الگ الگ ہو سکتی ہے! چنانچہ مرکزی وزیر اطلاعات' کوثر نیازی صاحب نے ۲۹ جولائی کو ملتان کے ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ

> اردو قومی زبان ہے مگر پنجابی کو پنجاب میں۔ بلوچی کو بلوچستان میں، اور سندھی کو سندھ میں علاقائی زبانیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ (نوائے وقت ۳۰/۷)

کہئے کہ جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہوا تھا اس میں' اور جو کچھ یہاں ہو رہا ہے' اس میں' کچھ بھی فرق ہے؟ اور اگر کچھ بھی فرق نہیں تو اس کا جو نتیجہ وہاں نکلا تھا وہی نتیجہ یہاں بھی برآمد نہیں ہوگا؟ ضرور ہوگا۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ وہاں ایک آزاد مملکت قائم ہوئی تھی' یہاں خیر سے چار آزاد مملکتیں قائم ہوں گی۔ اور انہیں جس کا جی چاہے گا چٹ کر لے جائے گا۔

قائداعظمؒ کا احترام

اس سارے شور و شغب میں لے دیکے ایک قائداعظمؒ کے نام کا احترام دلوں میں باقی رہ گیا تھا سو اسے بھی ختم کرنے کی مہم شروع ہو گئی ہے۔ اس کی بنیاد تقسیم ہند کے فوری بعد جماعت اسلامی نے رکھ دی تھی جب مودودی صاحب نے' اپنے رسالہ ترجمان القرآن کی اگست ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں تحریک پاکستان کے رہنماؤں کے متعلق جن کے سالار کارواں قائداعظمؒ تھے، لکھا تھا کہ

> اس پورے گروہ میں ایک کو بھی منہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گروں سے بچی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب کلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشہ دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے تھے۔

مودودی صاحب سے تو قائداعظمؒ کے حق میں کسی کلمۂ خیر کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی[1]۔ اس لئے کہ وہ تحریک پاکستان کے سخت مخالف تھے۔ وہ وہاں برملا کہتے تھے کہ

> لیگ کے قائداعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔ (ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ ص ۳۳)

لیکن اب وہ لوگ بھی قائداعظمؒ کے خلاف لب کشائی پر اتر آئے ہیں جو ان کے زیر سایۂ عاطفت تحریک پاکستان میں کام کرتے رہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں پیر علی محمد راشدی صاحب نے کراچی کے اخبار جنگ میں شائع شدہ ایک طویل مقا

---

[1] مودودی صاحب ہندوستان سے بھاگ کر پاکستان آ گئے تھے اور قائداعظمؒ نے نہایت کشادہ ظرفی سے انہیں یہاں پناہ دی تھی۔ اس لئے' اور کچھ نہیں تو کم از کم مروت اور احسان شناسی کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے محسن کے حق میں اس قسم کے الفاظ نہ کہتے۔ لیکن ان سے اس کی توقع بھی عبث تھی۔ (طلوع اسلام)

قائد اعظمؒ کے خلاف

میں یہ گنایا ہے کہ بانیانِ پاکستان نے کیا کیا غلطیاں اور کس کس قسم کی حماقتیں کی تھیں۔ اور یہ بات تو اب قریب قریب ہر تعلیم یافتہ نوجوان کی زبان سے سنی جا رہی ہے کہ قائدِ اعظم نے ہندوستان سے کٹ کر الگ مملکت کے قیام سے ہمیں سخت نقصان پہنچایا۔ مشرقی پاکستان میں بھی اسی طرح قائدِ اعظمؒ کے خلاف جذباتِ نفرت ابھارے گئے تھے جو آخر الامر اس قسم کی شرمناک حرکات پر منتج ہوئے کہ ان کی تصویر کو پاؤں تلے روندا گیا اور پاکستان کا پرچم جلایا گیا۔ یہاں کی سرکش ذہنیت کا رُخ بھی اسی طرف کو ہے۔

مغربی پاکستان کے باقی حصوں میں تو یہ کچھ علانیہ ہو رہا ہے لیکن غنیمت ہے کہ ابھی تک پنجاب میں اسلام، پاکستان اور قائدِ اعظمؒ کے خلاف اس قسم کے جذبات شدت تک نہیں پہنچے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پنجاب (بالخصوص اس کے قلب لاہور)

پنجاب کی بات

کی فضاؤں میں ہنوز اقبالؒ کی روح رچی بسی ہوئی ہے اس لئے یہاں کے عوام کی نگاہوں میں ابھی تک حیا، اور ان کے دل میں جذباتِ احترام باقی ہیں۔ لیکن یہاں بھی کچھ عرصہ سے ایک تحریک جاری ہے جس کا مقصد (ان لوگوں کے الفاظ میں) "اقبالؒ کے بت کا توڑنا ہے"۔ مقصد اس سے بھی اس نظریہ کا ابطال ہی ہے جس پر پاکستان کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ ورنہ اس کے سوا اقبالؒ کا کون سا جرم تھا جس کے لئے ان حضرات کو اس قسم کی بت شکنی کی ضرورت لاحق ہوتی!

---- (٠) ----

یہ ہے عزیزانِ من! وہ مقام جس پر کھڑے ہم آج کہنے کو پاکستان کی پچیسویں سالگرہ منانے لیکن درحقیقت خدا سے

اس کا انجام!

اس کے حق میں دعائے خیر مانگنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ پاکستان کا جو حصہ ہم سے چھن گیا ہے میں سردست اس کی بازیابی کی بات نہیں کر رہا۔ میں بات کر رہا ہوں اس حصہ کے تحفظ اور بقا کی جو ابھی تک ہمارے پاس ہے۔ میں نے حالات بے کم و کاست آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ ان کی روشنی میں سوچئے کہ اس وقت جو گھٹائیں چاروں طرف سے ہجوم کر کے اٹھ رہی ہیں وہ اگر اسی رفتار سے بڑھتی چلی آئیں تو ---- اور اس "تو" کے بعد مجھ میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں بجز اس کے کہ یٰلیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا ---- خدا کرے کہ وہ دن دیکھنا میرے نصیب میں نہ ہو! بغداد کی تباہی پر بلبلِ شیراز نے اپنے خونِ جگر سے جو مرثیہ لکھا تھا اس میں ایک آہِ فلک شگاف کیب ٹھی چلا کر کہا تھا کہ

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر زخاک
سر برآر و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں

میں اتنی جرأت تو نہیں کر سکتا کہ اس ہجومِ غم و آلام میں اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کو آواز دوں جس کی عظمت و تقدیس کا یہ عالم ہے کہ ؎

ہزار بار بشویم دہن بہ مشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبی است

اے قائدِ اعظمؒ!

میں اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ اک نالۂ دلدوز و آہِ جگر سوز کے ساتھ پکاروں کہ

قائدِ اعظمؒ! آپ کہاں ہیں؟

آیئے اور دیکھئے کہ آپ نے وہ متاعِ بے بہا جو آپ کے گریہ ہائے سحری اور فغانِ نیم شبی کا حاصل تھی، جن سپوتوں کے سپرد کی تھی، انہوں نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے اور کیا کرنے کے ارادے باندھ رہے ہیں ---- سالارِ کارواں! تیرے قافلہ کا یہ درماندہ راہی اس تیرہ و تار دشت کربِ الم میں تنہا مصروفِ نالہ و فغاں ہے۔ تو آ، اور کم از کم اس کے آنسوؤں کو اپنے دامنِ شفقت سے پونچھ دے! اس کا اتنا حق تو آپ پر ضرور ہے۔

کچھ نقش تری یاد کے باقی ہیں ابھی تک — دل بے سروسامان سہی ویراں تو نہیں ہے

عزیزانِ من! مجھے معاف کیجئے میں شدتِ غم میں بھٹک بھٹک کر کہاں آگیا! یہ غلط ہے۔ مایوسی ہمارے کیش میں کفر ہے۔ یہ خطہ پاک اب بھی بچ سکتا ہے لیکن اس کا علاج یہ ہے کہ جن بنیادوں پر اس مملکت کی عمارت استوار ہوئی تھی انہی بنیادوں کو پھر سے قائم کر لیا جائے۔ اس کے سوا اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ یاد رکھیئے

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے — وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

یہ علاج دو قسم کا ہوگا۔ ایک وہ جس کے اثرات فوری طور پر مرتب ہو جائینگے، اور دوسرا وہ جس کے نتائج کی نمود دیر میں جا کر ہوگی۔ لیکن ہوگا وہ مستقل اور دیرپا۔ فوری اثرات کے لئے کرنے کا کام یہ ہوگا کہ آئین میں یہ شق رکھی جائے کہ:

علاج اسکا؟

(۱) پاکستان میں رہنے والے تمام مسلمان اسلام کی بنیاد پر ایک قوم کے افراد ہیں۔ یہاں ایک سے زیادہ قوموں کا تصور رکھنا اور اسکی نشر و اشاعت کرنا مملکت کیخلاف بغاوت سمجھا جائیگا۔ غیر مسلم اس قوم کے افراد شمار نہیں ہو سکینگے۔

(۲) پاکستان کی مملکت اسلامی ہوگی، اس لئے یہاں سیکولر سٹیٹ کا نظریہ رکھنا اور اس کی نشر و اشاعت کرنا مملکت کے خلاف بغاوت شمار دیا جائے گا۔

(۳) مملکت کی وحدت اور سالمیت کے خلاف کسی قسم کا نظریہ رکھنا اور اسکی اشاعت کرنا، بغاوت قرار دیا جائیگا۔

(۴) پاکستان کی حکومت وحدانی انداز کی ہوگی صوبوں میں الگ الگ حکومتیں قائم نہیں ہوں گی۔

(۵) پاکستان کی قومی زبان ایک ہی ہوگی مختلف زبانیں بولنے والے لوگ نجی طور پر اپنی اپنی زبانیں استعمال کرتے رہیں لیکن کسی جگہ بھی سرکاری زبان، قومی زبان سے الگ نہیں ہوگی۔ ایسا مطالبہ یا عمل مملکت کے خلاف بغاوت قرار دیا جائے گا۔

(۶) بغاوت کی سزا خواہ وہ کسی شکل میں ہو موت اور ضبطیٔ املاک و مقبوضات ہوگی۔

جہاں تک دور رس نتائج کا تعلق ہے —

(۱) ملک کا نصابِ تعلیم پورے کا پورا بدلا جائے۔ اور اسے از سرِ نو اس طرح مرتب کیا جائے کہ طالب علموں کے قلب و دماغ میں یہ حقیقت علیٰ وجہ البصیرت راسخ ہو جائے کہ

(و) قرآن کریم انسانی زندگی کا واحد مکمل، غیر متبدل اور آخری ضابطۂ حیات ہے (قرآن کو آخری ضابطہ حیات تسلیم کرنے کا فطری اور منطقی نتیجہ ختمِ نبوت پر ایمان ہوتا ہے)

(ب) مسلم قومیت کا مدار اسلام ہے، اور رنگ، نسل، خون، زبان، وطن کی بنا پر تفریق یکسر خلافِ اسلام ہے۔

(ج) وحدتِ امت، وحدتِ ضابطۂ حیات کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس لئے مسلمانوں میں نہ مذہبی فرقے ہو سکتے ہیں، نہ مختلف سیاسی پارٹیاں۔

(۲) قرآن کریم کو بنیاد تسلیم کر کے ایسا ضابطہ قوانین مرتب کیا جائے جو پاکستان کے تمام مسلمانوں پر یکساں نافذ العمل ہو۔

اگر ایسا کر لیا گیا تو یہ خطہ زمین نہ صرف باقی اور محفوظ رہ جائے گا بلکہ ایسا مستحکم ہو جائے گا کہ کوئی دشمن اس کیطرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ آپ اس سے نہ گھبرایئے کہ ہم معاشی طور پر بہت کمزور ہیں۔ ہم میں اسلحہ کی کمی ہے۔ وسائل پیداوار غیر نشو و نما یافتہ ہیں۔ یہ سب چیزیں اپنی جگہ ضروری ہیں لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ مقدم حیثیت قوم کی وحدت اور یک جہتی کی ہے۔ قائداعظمؒ نے تحریکِ پاکستان کے آغاز میں کہا تھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ ہم جو جنگ

اور انگریز دونوں کے خلاف اتنی مہیب جنگ کرنے کے لئے اٹھے ہیں تو ہمارے پاس ساز و سامان کیا ہے سنیئے:۔

میرا یہ اٹاچی کیس (اور انہوں نے اس اٹاچی کیس کو اٹھا کر دکھایا تھا)۔ ایک ٹائپ رائٹر۔ اور میرا پرسنل اسسٹنٹ۔ یہ ہے ہمارا ساز و سامان۔ (تقاریر۔ جلد اول۔ ص۱۴۷)

لیکن اس کے باوجود ہمارے لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس لئے کہ (غالب کے الفاظ میں)

بے دست و پا نیم کہ ہنوز از وفورِ عشق
سودا ست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

ضرورت صرف اس جنون کی ہے جسے قائداعظمؒ نے (FAITH) کہہ کر پکارا ہے اور جسے قرآن ایمان کہتا ہے۔ ایمان کی قوتیں برادرانِ من! لامتناہی ہوتی ہیں۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا ۔ تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اور جب اس قسم کا ایمان قوم کے نوجوانوں میں پیدا ہو جائے تو ان کی کشور کشائی کی وسعتوں کا کیا ٹھکانہ؟ یہی وجہ تھی جو اقبالؒ نے بھی اپنی آہِ سحر گاہی کا وارث نوجوانوں کو قرار دیا تھا۔ قائداعظمؒ نے بھی بار بار یہی فرمایا تھا کہ

ہماری امیدیں قوم مسلم کے نوجوانوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ (تقاریر۔ جلد اول ص۲۰۶)

اور میں بھی عمر بھر انہی شاہینِ بچوں کو اپنے پیغام کا اولین مخاطب قرار دیتا چلا آرہا ہوں اور آج بھی میں ان سے یہی کہوں گا کہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے آپ سے جو توقعات وابستہ کی تھیں، ایک بار اٹھیئے اور انہیں پورا کر کے دکھائیے۔ پاکستان بچیگا تو آپ ہی کی قوتِ ایمان اور زورِ بازو سے بچیگا۔

ضرورت ہے نوجوانوں کی ایسی تنظیم کی جو ہر قسم کے تشدد، انتشار اور فساد سے مجتنب رہ کر نہایت پُرامن طریق سے اس پروگرام کے حق میں جسے میں نے پہلے پیش کیا ہے، رائے عامہ ہموار کرے تاکہ اسے آئینی طور پر بروئے کار لایا جا سکے اور اس طرح اقبالؒ کے اس نظریہ کو عملاً سچ کر دکھایا جائے کہ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود ۔ کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

ہم نے "سنگ و خشت" کو کافی آزما کر دیکھ لیا۔ آیئے اب ایک موقعہ فکر و بصیرت کو بھی دیکر دیکھ لیں۔ خدا کرے کہ یہ حقیقت کہ قوموں کی زندگی میں فکر و بصیرت کی کیا اہمیت ہے ہمارے نونہالانِ ملت کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے اور وہ اس صداقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی!
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارہ لعلِ ناب

ہم آج تک اس خطۂ پاک کے لعلِ ناب کو سنگِ خارہ بنانے میں مصروف رہے۔ آیئے اب اسکے سنگِ خارہ کو لعلِ ناب میں تبدیل کر کے دکھائیں۔

یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو

والسلام

حقائق و عبر

(۱) غیر شعوری طور پر

"اس قساوتِ قلبی کے بعد ہم جو باہمی قتل و غارت گری کے مرحلے میں داخل ہوئے ہیں اور جس وقت ہماری صفوں میں سب سے زیادہ اتحاد مطلوب تھا ہم انتشار ہی نہیں انارکی میں مبتلا ہو گئے ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟ لسانِ رسالتؐ سے اس کا جواب یوں صادر ہوا کہ، مالم تحکم ائمتھم بکتاب اللہ ویتخیروا مما انزل اللہ الا جعل اللہ باسھم بینھم۔ (اور جب تک ان کے قائدین، سربراہ کار اور حکام کتاب اللہ کو اپنا حاکم تسلیم نہ کریں گے اور اپنے پیش آمدہ مسائل میں اللہ کی نازل فرمودہ وحی سے راہ نمائی حاصل کر کے اسے ہر دوسری بات پر ترجیح نہیں دیں گے اللہ ان کو باہمی لڑائی میں مبتلا کر دے گا۔ لہٰذا کتاب اللہ ہی وہ واحد ذریعہ فلاح اور وسیلۂ امن ہے جو اقوامِ عالم کو بالعموم اور امتِ مسلمہ کو بالخصوص فساد، بدامنی، باہمی سر پھٹول اور جاہل بنیادوں پر ایک دوسرے سے دشمنی سے محفوظ رکھ سکتا ہے ..... اگر ہم سچے دل سے امن و سلامتی کے متمنی ہیں تو ہمیں یہ دولت صرف کتاب اللہ سے ملے گی۔ اسی سے دلوں کے بغض و عناد ختم ہوں گے۔ یہی کتابِ برحق رحمتِ الٰہیہ کے لئے وسیلہ بنے گی اور یہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے ہم فرحت و شادمانی حاصل کر سکتے ہیں ..... اور یہی وہ واحد مینارۂ نور ہے جو ان ظلمتوں سے ہمیں نجات دلا سکتا ہے جن میں ہم آج گھرے ہوئے ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ ہمیں پورے انبساط سے اپنے آپ کو بحیثیت فرد اور قوم قرآن عزیز کے حوالے کر دینا ہو گا اور جتنے بھی منکرینِ قرآن، دشمنانِ اسلام و ملّت اسلامیہ کو ہم نے اپنے راہ نما، دوست اور سرپرست بنا رکھا ہے، ان کی سرپرستی کا قلادہ اپنی گردنوں سے اتار پھینکنا ہو گا ..... اس امت نے جب تک قرآن مجید کو اپنا راہ نما بنائے رکھا، اسے سربلندی کے ساتھ ساتھ، اقوامِ عالم کی قیادت و امامت کے منصب پر بھی فائز رکھا گیا اور جب اس نے اس کتابِ برحق کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کی غلام قوموں کو اپنا راہ نما بنا لیا تو ہم اس منصب سے معزول کر دیئے گئے اور اپنے مقتدیوں اور پیروکاروں کے تابع مہمل بن کر رہ گئے ..... قرآن مجید ان تمام امور و مسائل میں، جن میں آج ہم سرگرداں ہیں اور تباہی کے راستے پر بگٹٹ بھاگے جا رہے ہیں، ہماری مکمل راہ نمائی فرماتا ہے۔"

آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ اقتباس طلوعِ اسلام کے کسی مقالہ یا خطاب سے لیا گیا ہے! جی نہیں۔ یہ خطبۂ جمعہ کے نکات ہیں جو لاہور سے شائع ہونے والے ہفتہ وار جریدہ المنبر کی ۱۴ جولائی کی اشاعت میں حسب ذیل جلی عنوان کے ساتھ صفحۂ اول پر شائع ہوئے ہیں۔

لسانی اور صوبائی عصبیت اور پاکستانیوں کا ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنا ــــ یہ سلسلہ اسوقت

تک جاری رہیگا — جب تک پاکستان کے قائدین کتاب اللہ کو اپنا حاکم تسلیم نہیں کریں گے۔

اور یہی ہے وہ عقیدہ جس کی بنا پر طلوعِ اسلام کے خلاف ان حضرات (ایک ہزار علمائے کرام) نے کفر کا فتویٰ صادر فرمایا تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات سچی بات کس طرح غیر شعوری طور پر زبان سے نکل جاتی ہے۔

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں ⁂ بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے

(٥)

۲- داڑھی (سنتِ رسول) کا استہزاء

پشاور سے ایک ہفت روزہ اخبار شائع ہوتا ہے — صدائے اسلام — اس کے مدیرِ اعلیٰ ہیں مولانا محمد یوسف قریشی مہتمم جامعہ شرعیہ پشاور۔ اس جریدہ کی ۱۲ جولائی ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں عنوان بالا کے تحت ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں لکھا ہے۔

حضرت مولانا عبدالعزیز خطیب زراعتی امام ساہیوالی فرمایا کرتے ہیں کہ مکہ معظمہ میں ایک بڑے عالم رہا کرتے تھے جماع کے بعد تہجد کے وقت جب وہ غسل کرتے تو پیرانہ سالی کے سبب ان پر کپکپی طاری ہو جاتی اور وہ کہتے شریعت نے خواہ مخواہ غسل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر غسل کا حکم نہ ہوتا تو کیا حرج تھا۔ وفات کے بعد ان کو مکہ معظمہ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ مدت کے بعد ان کی قبر ہڈیاں نکالنے کے لئے کھودی گئی تو دیکھا کہ ایک عورت کی لاش ہے لوگوں کو بڑا تعجب ہوا کہ مولوی صاحب تو عالم باعمل اور نیک آدمی تھے۔ انکی اہلیہ سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے بتلایا کہ مولوی صاحب تو واقعی نیک آدمی تھے لیکن غسل کے بعد مذکورہ بالا الفاظ کہتے تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ واقعی یہ اس کی سزا ہے۔ اندازہ فرمائیں کہ شریعت کی تحقیر کا کیا انجام ہوا! ع عذرے سخن داستان ان کی!

حجاج میں سے ایک شخص نے اس عورت کی لاش پہچانی اور کہا کہ یہ انگلستان کی رہنے والی تھیں اور مسلمان ہو چکی تھیں۔ انکے خاندان کے سب افراد عیسائی تھے چنانچہ ان کی نشاندہی پر انگلستان ایک عالم صاحب گئے اور عورت کے والدین سے ملے اور انکے والدین کو ساتھ لے کر اس عورت کی قبر اکھاڑی گئی تو دیکھا کہ مولوی صاحب کی لاش موجود ہے جن کو مکہ معظمہ میں دفن کیا گیا تھا۔ اس روح فرسا واقعہ سے داڑھی منڈے عبرت حاصل کریں اور داڑھی کا استہزاء و تضحیک چھوڑ دیں ورنہ امتِ محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں محشور نہ ہونگے۔

کیا دین سے باغی، سرکش نوجوانانِ ملت، اب بھی اسلام کی صداقت کے قائل نہیں ہوں گے؟

(٥)

۳- کچھ دارو مدار!

محترم صدرِ مملکت (مسٹر بھٹو) نے اپنے سابقہ دورۂ سندھ کے سلسلہ میں "دادو" میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ طلباء سیاست میں حصہ لیتے ہیں لیکن انہیں سیاست میں صرف اس حد تک ہی حصہ لینا چاہیئے کہ ان کی تعلیمی سرگرمیوں پر ناگوار اثر نہ پڑے۔ لیکن آجکل یہ بد رجحان پیدا ہو گیا ہے کہ طالب علم کتابیں اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیتے ہیں۔ اور جب امتحانات سر پر آتے ہیں تو انہیں ملتوی کر دینے کے لئے شور برپا کر دیا جاتا ہے۔ یہ کوئی اچھا وطیرہ نہیں ہے۔ کراچی یونیورسٹی اور سندھ کے طلباء اگر چاہیں تو زبان کے مسئلہ پر سارا جھگڑا یکسر ختم ہو سکتا ہے۔

(نوائے وقت - ۱۷ جولائی ۷۲ء)

صدر محترم نے یہ نصیحت تو فرما دی لیکن وہ طریقہ نہیں بتایا جس سے طلباء سیاسیات میں حصہ بھی لیں اور ان کی تعلیمی سرگرمیوں پر ناگوار اثر بھی نہ پڑے۔ یہ "کج دار و مریز" ممکن کیسے ہوگا؟ ہم تو یہی جانتے ہیں کہ ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔ تعلیم حاصل کرنا یا سیاست میں حصہ لینا۔ سیاست تو وہ بلا ہے کہ جو اس کوچہ میں آیا پھر کسی اور کام کے قابل نہ رہا۔ ہم خود صدر محترم سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ جب سے سیاست میں آئے ہیں بڑی بڑی باتوں کو تو چھوڑیئے کیا وہ اپنی زندگی کے روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں کی طرف بھی توجہ دے سکے ہیں یا اس دوران میں وہ پالیٹکس کے علاوہ کسی اور موضوع پر کسی (Serious) کتاب کا بھی بہ انہماک سے مطالعہ کر سکے ہیں! جب وہ خود ایسا نہیں کر سکے۔ اور عملی سیاست میں حصہ لینے والا شاید ہی کوئی ایسا کر سکتا ہو۔ تو وہ طالب علموں سے اس قسم کی توقع کس طرح کر سکتے ہیں کہ وہ عملی سیاست میں بھی حصہ لیں اور اپنی تعلیمی سرگرمیوں پر اس کا ناخوشگوار اثر بھی نہ پڑنے دیں! یہ ٹھیک ہے کہ کبھی کبھار کوئی نابغہ روزگار (GENIUS) ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو سیاسی مصروفیات بلکہ کارزار کی سرگرمیوں کے ساتھ علمی مشاغل بھی جاری رکھ سکے لیکن یہ چیز طالب علموں کے بس کی بات نہیں اور اس کی شہادت تو خود صدر مملکت نے یہ کہہ کر بہم پہنچا دی ہے کہ طالب علم سیاست میں حصہ لیتے ہیں تو کتابوں کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور پھر امتحان کے ملتوی کر دینے کے لئے شور مچاتے ہیں۔

ہم ملک کے ناصحین مشفق کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ ان نوجوانوں (اور خود اس بدنصیب قوم) کی حالت پر رحم کریں اور طالب علموں سے یہی کہیں کہ آپ "طالب علم" ہیں اس لئے دوران تعلیم اپنی زندگی کا مقصد علم کی طلب اور جستجو سمجھیں۔ سیاسی دھندوں کے لئے اس کے بعد بہتیری عمر پڑی ہے۔ (اس دور کی عملی سیاست انہی کا کام ہے جن کے ہاں کھانے کو ہو (یا وہ خود سیاست کو ذریعہ معاش بنا لیں) اور انہیں پھر دین دنیا کی کوئی فکر نہ ہو۔ طلب علم اور عملی سیاست ایک وقت میں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ یہ تو علم اور سیاست ہے غالب نے تو تماشائے محبت کو بھی (جس کے متعلق اس نے خود کہا تھا کہ۔ ہے یہ وہ آتش غالب کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے) فرصت پر اٹھا رکھا تھا جب کہا تھا کہ۔

دکھاؤں گا تماشہ دی اگر فرصت زمانے نے — مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

لیکن طالب علموں کو ایسی نصیحت وہی لوگ کر سکیں گے جو اس قسم کی مفت میں مل جانے والی بے سری فوج کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال نہ کرنا چاہیں۔ لیکن اس (TEMPTATION) کو (RESIST) کرنے کیلئے بڑی ہمت درکار ہوگی اور یہ ہمت بھی اسی کو حاصل ہوگی جو پاکستان کے مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دے۔

(۰)

۴۔ بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں پر ٹھہرے

پچھلے دنوں شیعہ حضرات کا ایک وفد بسر کردگی نواب مظفر علی قزلباش صدر مملکت سے ملا اور ان سے کہا کہ شیعہ حضرات کا یہ مطالبہ کہ ان کے بچوں کے لئے "دینیات کا نصاب" (باقی مسلمانوں سے) الگ ہونا چاہیئے ایک عرصہ سے تسلیم شدہ ہے لیکن اس پر عملدرآمد آج تک نہیں کیا گیا۔ صدر مملکت نے اس پر اظہار تأسف کیا (کہ اس پر اس وقت تک عمل کیوں نہیں کیا گیا) اور وعدہ کیا کہ اب ایسا جلدی ہو جائے گا۔

(پاکستان ٹائمز۔ ۲۰ اگست ۱۹۷۲ء)

اس کے بعد یہ دیکھنا چاہیئے کہ مسلمانوں کے باقی فرقوں کی طرف سے اس قسم کے مطالبات کب پیش ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اس باب میں اختلافات شیعہ اور سنی حضرات ہی میں نہیں، خود سنیوں کے مختلف فرقوں میں بھی کافی اختلافات ہیں۔ ان میں سے ہر فرقے کے مکاتب اور دار العلوم (جن میں "دین کی تعلیم" دی جاتی ہے) الگ الگ ہیں۔ ملک میں

(۱) چار قومیں اور ہر قوم کا مطالبہ الگ الگ۔
(۲) چار صوبے اور ہر صوبے کی سرکاری زبان الگ الگ
(۳) مختلف سیاسی پارٹیاں اور ہر پارٹی کا منشور الگ الگ
(۴) مختلف مذہبی فرقے اور ہر فرقے کے بچوں کے لئے دینیات کا نصاب الگ الگ۔

اور اس کے باوجود ہم میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ کہ ہمارا خدا ایک، رسول ایک، کتاب ایک اور دین ایک ہے۔

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا؟ خدا فریبی کہ خود فریبی!

سوچئے کہ جو علماء حضرات ایسا اسلامی نصاب مرتب نہیں کر سکتے جو مسلمانوں کے تمام بچوں کو مشترکہ طور پر پڑھایا جا سکے وہ مملکت کے لئے ایسا ضابطہ قوانین کب مدون کر سکیں گے جو سب فرقوں کے لئے قابل قبول ہو؟ یاد رکھئے کہ ایسا نصاب بھی مرتب ہو سکتا ہے جو سب بچوں کو یکساں طور پر پڑھایا جا سکتا اور ایسا ضابطہ قوانین بھی مدون کیا جا سکتا ہے جو تمام مسلمانوں کیلئے قابل قبول ہو، بشرطیکہ مُلّا راستے سے ہٹ جائے۔

(٥)

۵۔ ہم بھی کچھ نہیں کہنا چاہتے

لاہوری جماعت احمدیہ کے ترجمان "پیغام صلح" کی ۹ مارچ ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں حسب ذیل شذرہ شائع ہوا تھا۔

" ایک ہفت روزہ اخبار تنظیم اہلحدیث رقمطراز ہے: ــ "۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد جب پاکستان کا مطالبہ ایک ملک گیر صورت اختیار کر گیا تو کسی شخص نے ایک احمدی بھارتی قائد سے پوچھا کہ اب جبکہ پوری مسلمان قوم نے پاکستان کے مطالبہ کو اپنا لیا ہے آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟ انہوں نے بڑے ہی پرشکوہ زعم سے جواب دیا کہ بیشک مسلمان زور لگاتے رہیں، جس مادی قسم کا وہ پاکستان چاہتے ہیں وہ کبھی نہیں بن سکتا۔" (روزنامہ الفضل ۔ ۸ جون ۱۹۴۵ء)

مگر اللہ تعالیٰ نے جب مسلمانوں کی پرزور تحریک کو شرف قبولیت سے نوازتے ہوئے انہیں ایک آزاد اور خود مختار خطہ زمین "پاکستان" کے نام سے بخش دیا تو سائل نے پھر انہی کی طرف رجوع کیا اور کہا کہ آپ تو کہتے تھے کہ یہ پاکستان بن نہیں سکتا مگر اب جبکہ وہ بطور ایک واقعہ کے نقشہ عالم پر ابھر آیا ہے اب آپ کا موقف کیا ہے؟ انہوں نے لب برداشتہ جواب دیا ـــ "ہندوستان کی تقسیم پر ہم راضی ہوئے ہیں تو خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے، اور پھر کوشش کریں گے کہ کسی نہ کسی طرح جلد متحد ہو جائیں۔" (الفضل ۔ ۱۷ مئی ۱۹۴۷ء)

اخبار مذکور لکھتا ہے کہ اسے آپ یہ معلوم کر کے دم بخود رہ جائیں گے کہ یہ دونوں تقریریں قادیانی نبوت کے خلیفہ بشیر الدین محمود احمد صاحب کی ہیں۔

اخبار مذکور نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے صدر پاکستان کو ان کا اقتصادی مشیر جناب ایم۔ ایم۔ احمد اور ان کے دوسرے ہم مشرب ساتھیوں کے متعلق لکھا ہے کہ میاں محمود احمد صاحب کا بیان ان کے مذہب کا جزو، ان کے عقیدہ کی بنیاد اور ان کے دین کا حصہ ہے۔ ہم اس بارہ میں کچھ نہیں کہتے صرف زعمائے ربوہ سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا میاں صاحب کا یہ بیان ان کے نزدیک صحیح ہے اور وہ اب بھی پاکستان کے متعلق وہی عقیدہ رکھتے ہیں جس کا ذکر میاں صاحب کے مندرجہ بالا بیان میں کیا گیا ہے؟ "

ہم بھی اس بارہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتے صرف جریدہ پیغام صلح سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا انہیں زعمائے ربوہ کی طرف سے ان کے استفسار کا کوئی جواب موصول ہوا ہے؟

(٥)

۶۔ جمعیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

" ہاکس بے" کراچی کا حشر انگیز المیہ جس میں سکولوں (اور کالجوں) کی مظلوم اور معصوم بچیاں نہایت کس مپرسی کے عالم میں جیتی جاگتی، کالجی درندوں کی ہوسناکی کا شکار ہو گئی تھیں اور جس نے قوم کے ضمیر کو لرزا دیا تھا، ابھی ماجرائے فردا بھی نہ بننے پایا تھا کہ کراچی کے روزنامہ جنگ کی ۲۵ جولائی میں شائع شدہ خبر نے حساس قلوب کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا ہے۔ خبر یہ ہے۔

گورنر سندھ میر رسول بخش تالپور کے حکم پر ہاکس بے کیس میں ملوث سات طلبا کو آج دوپہر دو بجے رہا کر دیا گیا۔ ان طلبا کو خصوصی فوجی عدالت نے ۵ سال تک کی سزا دی تھی۔

ہم اس سلسلے میں جناب عزت مآب گورنر سندھ سے اتنا دریافت کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ اگر (خدانخواستہ۔ خدانکردہ) اس قسم کا حادثہ ان کی اپنی بچی کے ساتھ پیش آیا ہوتا تو کیا اس وقت بھی ان کے ترحم خسروانہ کی جولانیوں کا یہی عالم ہوتا؟

اور ہم تو آج تک یہ بھی نہیں سمجھ سکے کہ جس مجرم کو عدالت قانون کے مطابق کوئی سزا دے اسے انتظامیہ معاف کیسے کر سکتی ہے؟

(بقیہ ۱۷)

طلوعِ اسلام کنونیشن

مجلسِ مذاکرہ

منعقدہ ۲۲ اپریل ۱۹۷۸ء بروز ہفتہ

موضوع:- "آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا"

صدارت:- محترمہ ڈاکٹر مس کنیز فاطمہ یوسف۔ پرنسپل لاہور کالج فار وومن۔

شرکائے مجلس

۱۔ سلمیٰ لطیف (ساتویں جماعت کی طالبہ)
۲۔ تبسم سلطانہ (نویں جماعت کی طالبہ از جھنگ)
۳۔ رضوان نبیل (طالب علم۔ ایف۔ ایس سی۔)
(ایف۔ سی۔ کالج۔ لاہور)
۴۔ ثریا عندلیب۔
۵۔ شاہد امین حیدر (بی۔ ایس۔ سی۔ طالب علم)
۶۔ شاہدہ منظور (طالبہ ایم۔ اے اسلامیات۔ از گجرات)
۷۔ ایم۔ نذیر خٹک (ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ۔ مردان)
۸۔ نوشابہ سجانی (ایم۔ اے)۔ واہ کینٹ۔
۹۔ شہزاد قیصر (ایم۔ اے فلسفہ۔ گولڈ میڈلسٹ)
(تقریر انگریزی میں تھی اس لئے درج نہیں کی جا رہی)
۱۰۔ گوگی (پانچویں جماعت کا طالب علم)
۱۱۔ تنویر جہاں (طالبہ۔ ایم۔ اے۔ عربی)
۱۲۔ غلام صابر (ایم۔ اے)
۱۳۔ عارفہ سلطانہ۔ (ایم۔ اے اردو، ایم اے فلسفہ
ریسرچ سکالر)
۱۴۔ صحنِ خانہ پیرو تربیتی دو بچیاں ـــ
نجمہ صفدر (بی۔ اے)
سلمیٰ پرویز (ایم۔ اے)
۱۵۔ خالدہ سرور۔ (جماعت چہارم)
اپنی پاکٹ منی سے کالج فنڈ میں عطیہ کا اعلان
کرنے کے لئے شریکِ محفل ہوئی۔

(۰)

(۱)

سلمیٰ لطیف

صدرِ گرامی! پچھلے سال اسی اسٹیج سے ہم نے اپنی مشکلات بیان کرتے ہوئے صرف اتنا پوچھا تھا کہ اب تو ہی بتا

تیری مسلمان کدھر جائے۔ خیال تھا کہ اس وقت نہیں تو کم از کم اس سال اس سوال کا جواب ضرور دیا جائے گا۔ لیکن مذاکرے کا عنوان پڑھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے بزرگ کہہ رہے ہوں کہ بیٹی تم کیا راستہ پوچھ رہی ہو۔ یہاں تو آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا۔ حالانکہ میں نے تو یہاں تک سن رکھا ہے کہ ہمارے بزرگ گدھے کو انسان بنا دیا کرتے تھے پھر کہاں گیا وہ نسخہ ؟ — یہ ہے وہ سوال جو پچھلے دنوں میں نے اپنے ایک بزرگ سے پوچھا۔ جو بہت بڑے عالم ہیں اور مجھے اکثر مذہب کی باتیں بتایا کرتے ہیں۔ سُنا دوں آپ کو وہ جواب جو انہوں نے دیا تھا۔ مجھے یاد ہے انہوں نے کہا تھا کہ انسان بنانے کا نسخہ تو بے شک ہمارے پاس موجود ہے۔ لیکن ہم اُسے استعمال نہیں کرنا چاہتے۔ اس لئے کہ جو مزا آدمی رہنے میں ہے وہ انسان بن کر کہاں۔ کہاں یہ آزاد زندگی، کہاں وہ قدم قدم پر اصولوں کی پابندی۔ یہ کرو۔ یہ مت کرو۔ یوں کہو۔ یوں مت کہو۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ پھر آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔ کہنے لگے۔ یہ اُن لوگوں کی حوصلہ شکنی کے لئے جن کے سر پر انسانیت کا بھوت سوار ہے۔ تو دیکھتی نہیں طلوعِ اسلام والوں نے کیا رَٹ لگا رکھی ہے۔ اور اب تو سُنا ہے وہ یونیورسٹی کے پاس نہر کے کنارے ایک کارخانہ بھی لگا رہے ہیں۔ میں نے کہا کارخانہ تو نہیں، وہ تو ایک کالج ہے جہاں بچوں کو قرآنِ حکیم کے مطابق تعلیم دی جائے گی۔ مولوی صاحب کہنے لگے یہ سب فراڈ ہے۔ دراصل یہ لوگ قرآن کی آڑ میں نوجوانوں کو مذہب سے دور لے جانا چاہتے ہیں اور اپنے اس حربے کو دین کا نام دیتے ہیں۔

صدر گرامی! یہ تو خیر میں نہیں جانتی کہ قرآن پڑھنے سے آدمی مذہب سے کیونکر دور ہو جاتا ہے اور طلوعِ اسلام والے کیا چاہتے ہیں لیکن اس گفتگو سے میں اتنا ضرور سمجھ گئی کہ آدمی کو انسان بنانے کا نسخہ اب بھی موجود ہے اور اگر کوشش کی جائے تو آدمی انسان بن بھی ضرور سکتا ہے۔

میں نے اپنے ابو سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے بتایا کہ تفصیل سے سمجھانا تو ذرا مشکل ہے بس تم اتنا سمجھو کہ آدمی خام مسالہ ہوتا ہے جسے انسان بنانے کے لئے ایک خاص کارخانے میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ غالبؔ کو یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ اس کے زمانے میں ایسا کوئی کارخانہ موجود نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ مولوی صاحب نے جس کالج کو طنزاً کارخانہ کہا ہے، وہ درحقیقت ہے بھی ایک کارخانہ جو طلوعِ اسلام کالج کے نام سے وجود میں آرہا ہے اور اگلے سال اس کارخانے سے انشاء اللہ پروڈکشن شروع ہو جائے گی۔ یہ سن کر مجھے از حد خوشی ہوئی اور میں نے خدا سے دعا مانگی کہ اگلے سال کنونشن کے موقع پر ایک نمائش بھی لگے جس میں انسان دکھائے جائیں۔ سُنا ہے پچھلے سال غالبؔ کراچی کی بندر روڈ پر آیا تھا۔ اگر وہ اگلے سال پھرتے پھراتے یہاں آگیا تو ہم اُسے جھٹلائیں گے کہ دیکھو آدمی کو انسان بنانا میسر ہے یا نہیں۔ اُف! کیا مزا آئے گا جب ہم بڑے میاں کو جھٹلائیں گے۔ کیوں باباجی! ہم غالبؔ کو جھٹلا سکیں گے ناں!

---

(۲)

تبسم سلطانہ

صدر محترم، عزیز بہنو، بھائیو اور واجب الاحترام بزرگو! ایک ننھی بچی کا سلام لو۔

گاؤں میں بشیر میری ایک ننھی سہیلی ہے۔ میں جب کبھی گاؤں جاتی ہوں تو اسی کے ساتھ کھیلتی ہوں۔ قد بُت اور عمر میں وہ

مجھ سے چھوٹی ہے لیکن ہے بڑی ذہین۔ پڑھنے لکھنے کا اسے اتنا شوق ہے کہ گھر پر ہی اپنے بھائیوں سے وہ دوسری جماعت کی کتاب بھی پڑھ چکی ہے۔

ایک دن میں جوان کے گھر گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ گھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ اس کے چچا، تایا، دادا، دادی، سبھی اس کی امی پر برس رہے ہیں۔ امی بیچاری استادہ رو رہی ہے کہ بات کرنا اس کے لئے مشکل ہو رہا ہے۔ رضیہ الگ رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔ میں نے اسے تسلی دی اور اس سرد مہری جھڑپ کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ رضیہ کی امی نے اسے سکول بھیج دیا تھا جس پر اس کی برادری کے بھی لوگ سیخ پا تھے۔ رضیہ کے دادا پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ تم نے ہماری ناک کاٹ ڈالی۔ لڑکیوں کو سکول بھیجنا آخر کہاں کی شرافت ہے۔ انہیں کون سا پٹواری یا تھانیدار بننا ہے۔ آج تم نے اسے سکول بھیجا ہے تو کل اس کے بال کٹوا دو گی اور پھر پکلیوں میں آوارہ پھرے گی۔ برادری ہمارا حقہ پانی بند کر دے گی۔ خبردار! جو آئندہ اسے سکول بھیجا۔

صاحب صدر! یہ کافی دنوں کی بات ہے لیکن یہ بات میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ رضیہ مویشیوں کو پانی پلانے نکال پر جا سکتی ہے۔ باپ کا کھانا لے کر دو میل دور کھیتوں میں جا سکتی ہے۔ ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے پر اس کے دادا دادی کو کوئی اعتراض نہیں۔ تو پھر اس تھوڑی سی دیر کے لئے اس کے سکول جانے پر اتنا شدید غم و غصہ کیوں؟ حالانکہ میری امی کہتی ہے کہ آدمی پڑھ لکھ کر انسان بن جاتا ہے۔ کیا یہ لوگ نہیں چاہتے کہ رضیہ بھی اپنے بھائیوں کی طرح پڑھ لکھ کر انسان بن جائے۔ ابھی یہ گتھی میں کبھی نہ پائی تھی کہ مذاکرے کا عنوان سامنے آیا۔ عنوان کو پڑھا تو میرے ذہن میں خیال آیا کہ ان دادے دادیوں کی موجودگی میں گاؤں کے لڑکوں کو انسان ہونا تو شاید میسر ہو جائے لڑکیوں کو انسان ہونا میسر نہیں ہوگا۔ (سٹیج کی طرف اشارہ کر کے) کیوں باجی! میری بات سچی ہے نا!!

---

(۳)

رضوان فیصل

اس سے پہلے کہ میں اپنے بیان کا آغاز کروں میں سمجھتا ہوں کہ ایک دو امور کا فیصلہ اس موضوع کو سمجھنے میں مدد دے گا سب سے پہلے ہمیں انسان اور آدمی میں فرق متعین کرنا ہے۔

صدر ذی احتشام!

ہر پیدا ہونے والی شخصیت بنیادی طور پر آدمی کہلاتی ہے۔ اس کو کچھ مثبت صلاحیتیں فطرت سے بلا معاوضہ اور بلا تمیز رنگ و نسل ملتی ہیں۔ جو شخص ان مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کرے وہ انسان کہلاتا ہے۔ یہ محمدؐ کا مومن ہو، یا اقبالؒ کا مرد حُر، یا پھر ابوالکلام کا مرد آزاد۔ یہ انسان ہی کے مختلف نام ہیں۔ مگر جیسا کہ حالیؔ نے کہا ہے:

فرشتے سے بہتر ہے انسان ہونا مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نشوونما کیسے کی جا سکتی ہے؟ اس بارے میں تین گروہ پائے جاتے ہیں۔

(i) پہلا گروہ عقل و فکر کا دشمن۔ یعنی اہل مذہب۔ (اہل دین نہیں)

(ii) دوسرا گروہ صرف عقل کے تابع چلنے والا

(iii) تیسرا گروہ عقل اور آسمانی وحی کا حسین امتزاج

حضرات! جہاں تک عقل کا تعلق ہے قرآن قدم قدم پر دعوتِ فکر دیتا ہے۔ عقل ہی تو ہمیں جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔

صدرِ عالی مقام! عقل جد و جہد زندگی ہے۔ شب و روز زندگی ہے۔ اگر عقل نہ ہوتی تو یہ جہان رنگ و بو نہ ہوتا۔ تاریخ نہ ہوتی معمارِ تاریخ نہ ہوتے۔ عبرت انگیز واقعات نہ ہوتے۔ ماضی کی روشنی میں مستقبل کی تعمیر ممکن نہ ہوتی۔ سلطنتیں نہ ہوتیں۔ عالیشان بادشاہتیں نہ ہوتیں۔ ہنگامۂ زندگی نہ ہوتا۔ اندیشہ ہائے دور دراز نہ ہوتے۔ خطرہ ہائے دل و جان نہ ہوتے۔ یہ زندگی کی سکراہٹ یہ صباحت، یہ ملاحت، یہ نکہت، یہ فرحت سب عقل کی شرمندۂ احسان ہیں۔

مگر صرف اور صرف عقل پر تکیہ خالی از خطرات نہیں۔ صرف عقل پر چلنے والے کی مثال اس مسافر کی سی ہے جو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کھڑا ہے۔ بجلی چمکتی ہے تو وہ دو قدم چل لیتا ہے۔ جب پھر اندھیرا ہو جاتا ہے تو وہ بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔ مگر معزز صدر! قرآن پر چلنے والے کبھی تاریک راہوں میں نہیں مارے جاتے۔ قرآن ہمیں مستقل اقدار دیتا ہے جو ابدی ہیں۔ کبھی نہیں بدلتیں کبھی روپوش نہیں کرتیں۔ ان مستقل اقدار کے مطابق کسی شخص کی نشو و نما ہی تو انسانیت کا دوسرا نام ہے۔

اعمالِ حسنہ انسانی صلاحیتوں میں جلا پیدا کرتے ہیں حُسن کیا ہے؟ توازن کا دوسرا نام۔ اعمالِ حسنہ کیا ہیں؟ ناہمواریوں کو ہمواریوں میں بدلنا۔ زندگی کی متضاد قوتوں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں توازن پیدا کرنا۔

معزز سامعین! انسان وہی ہے جو دوسروں کے لئے زندہ رہے۔ جو زمین پر بوجھ نہ بنے بلکہ زمین کا بوجھ اٹھائے۔ مگر آدمی ہمیشہ انفرادی نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہے۔ اپنی نجات کی فکر کرتا ہے۔ انفرادی مفاد بُری چیز نہیں مگر جب تک اُسے وسیع تر مفاد کے تابع رکھا جائے۔ آدمی ہمیشہ اپنے لئے سوچتا ہے مگر انسان انسانیت کے لئے سوچتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو!
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

محترمہ صدر صاحبہ! اگر انسان انسانیت کی حدود کو چھو لے تو وہ اشرف المخلوقات ہو جاتا ہے اور اگر انسانیت کو چھوڑ دے تو دام و دد سے بھی بدتر۔ انسان کے کردار، گفتار، افکار، رفتار، دستار، غرضیکہ ہر ایک پہلو سے انسانیت نمایاں ہونی چاہیئے۔ جو شخص اپنی ابلیسی قوتوں کو اپنے سامنے جھکا لے وہ انسان ہے، اور جو ان کے سامنے جھک جائے وہ آدمی۔ مگر جب دین مذہب میں تبدیل ہو گیا تو یہ اقدار بھی ختم ہو گئیں۔

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پروین کا اسیر

مذہب آیا تو اس نے آدمی کو سوچ بچار سے روک دیا۔ اس کے ذہن اور دماغ پر پابندیاں لگا دیں۔ اس کی فکری قوتیں سلب کر لیں اور آدمی انسان ہونے کے شرف سے محروم ہو گیا۔ آج کے بیشتر آدمی انسان کہلانے کے حقدار نہیں۔ اگر یہ انسان ہوتے تو یہ دنیا میدانِ جنگ کے بجائے امن کا گھر ہوتی۔ یہ کائنات دارالحزن کے بجائے جنت کا ٹکڑا ہوتی۔

میں (THE MAKING OF HUMANITY) کے مشہورِ آفاق مصنف برفالٹ کے الفاظ مستعار لیتا ہوں جس نے کہا ہے کہ

کلچر اور تہذیب سے مراد صرف آرٹ، مادی عیش و آرام کی چیزیں اور علم و عقل کی فراوانیاں نہیں بلکہ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے باہمی معاملات میں عدل و انصاف اور انسانیت کو کس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے۔

مذہب مصنوعی تہذیب مقرر کرتا ہے مگر دین تو ایک پاکیزہ معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ جہاں کسی کے دل میں دوسرے سے چھپانے کے لئے کوئی بات نہیں ہوگی۔ مگر آج رشوت ایک ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ بے ایمانی ایک معمولی چیز گنی جاتی ہے۔ لوگ طوائف کو سوسائٹی گرل کہتے ہیں۔ بدمعاشی کو کلچرل پروگرام کہتے ہیں۔ دھوکے کو برنس اور خوشامد کو شائستگی کہتے ہیں۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جناب صدر! اب میں اس موضوع کی طرف آتا ہوں کہ آدمی کو انسان بننا کیوں میسر نہیں۔ میسر کے لفظی معنی آسان کے ہیں۔ تو وہ کون سی دشواری تھی جو انسانیت کی راہ میں حائل ہو گئی۔

سب سے پہلے تو میں اس کے معاشی پہلو کی طرف آؤں گا۔

شروع کے زمانے میں آدمی کی معدودے چند ضروریات ہوتی تھیں۔ کھانے کے لئے وہ کسی جانور کا شکار کر لیا کرتا تھا۔ اور پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کر لیتا تھا یا پھر جنگلی پھلوں پر بھی گزارا کر لیتا تھا۔ جسم ڈھانکنے کے لئے بھی اس کو کچھ زیادہ تردد نہیں کرنا پڑتا تھا۔ جس جانور کو مارتا اسی کی کھال سے جسم بھی ڈھانپ لیتا تھا یا پھر خس و خاشاک پر ہی قناعت کر لیتا تھا۔ باقی رہا سر چھپانے کا مسئلہ تو یہ بھی وہ آسانی سے حل کر لیا کرتا تھا کسی کھوہ میں چھپ کر رات بسر کر لیتا یا پھر کسی چٹان کی اوٹ میں ہی پڑا رہتا تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اس وقت ضروریات ذرائع سے کم ہوتی تھیں۔ ملکیت کی حدیں بھی متعین نہیں ہوتی تھیں۔ جہاں سے کوئی چاہتا تھا کھا سکتا تھا اس لئے کسی معاشی مسئلے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اسی لئے تو قرآن نے اس معاشرے کو جنتی معاشرہ کہا ہے۔ حاصلِ کلام یہ کہ اس وقت کوئی چیز انسانیت کی راہ میں حائل نہیں تھی۔ مگر جوں جوں آدمی اپنی خواہشات کو بڑھاتا گیا اپنی ضروریاتِ زندگی میں اضافہ کرتا گیا۔ معاشی مسائل پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ پھر یہی مسائل معاشرتی مسائل کی بنیاد بنا لئے گئے اور انسانیت کی راہ میں رخنہ اندازیاں شروع ہو گئیں۔ اس لئے آج حصولِ کمالِ انسانیت پہلے کی نسبت کہیں مشکل ہے۔ مگر یہ ناممکن اب بھی نہیں۔ فردوسِ گم گشتہ دوبارہ حاصل کی جا سکتی ہے۔

اب میں انسانیت کے محرکات کی طرف آؤں گا یعنی وہ چیزیں جو آدمی کو انسان بننے میں مدد دیتی ہیں۔ بلکہ انسان بننے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

میرِ مجلس! آج سے چودہ سو سال پہلے انبیاء آنے بند ہو گئے۔ جب تک انبیاء آتے رہے انسانیت کی راہیں صاف اور واضح تھیں اور انسانیت کا محرک انبیاء اور ان کا ترتیب دیا گیا معاشرہ ہوتا تھا۔ اور اس کام کا صلہ بھی جزوی طور پر محسوس شکل میں ہی ہوتا تھا یعنی ان کو دنیاوی جنت مل جاتی تھی۔ مگر جب سے انبیاء آنے بند ہو گئے حصولِ کمالِ انسانیت دشوار سے دشوار تر ہوتا چلا گیا کیونکہ آجکل انسانیت کا محرک غیر محسوس ہے اور اہلِ مذہب کے ہاں اس کا صلہ یا نتیجہ بھی غیر محسوس ہے جو کہ بقول ان کے آخرت میں ملے گا۔

ان کے ہاں دنیا اور آخرت دو الگ الگ جہان ہیں۔ یہاں کے لئے الگ کام کرنا پڑتا ہے (بلکہ وہ تو دنیا سے نفرت کرنا ہی سکھاتا ہے) اور آخرت کے لئے الگ ثواب کمانا پڑتا ہے۔ اس لئے کسی شخص کو اس قسم کا انسان بننے پر کوئی چیز مجبور نہیں کرتی۔ اور نہ ہی اس کو اس میں کوئی فائدہ نظر آتا ہے۔ تو صاحب صدر! مجھے کہنے دیجئے کہ لوگوں کا خود ساختہ

مذہب ہی دشواری حصولِ کمالِ انسانیت کی اصل وجہ ہے۔

اس قرآنی معاشرے نے تو انسان سے ایسے ایسے کام کروائے جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تپتی ریت پر ننگا لیٹ کر اور سینے پر تپتے ہوئے بھاری پتھر رکھوا کر بھی اپنے مسلک سے نہ ہٹنے والا اسی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے جو اب ختم ہو چکا ہے۔

اسے ہماری بدقسمتی کہہ لیجئے یا پھر کچھ اور کہ ہمارے یہاں چند ایک ہی ایسی تحریکیں اور شخصیات موجود ہیں جو محرکِ انسانیت بن سکیں۔ اگر کچھ ہیں بھی جیسے "طلوعِ اسلام" تو وہ سمٹی ہوئی ہیں۔ اس کے برعکس ایک سی ایس۔ پی یا ڈاکٹر یا انجینئر بننے کا محرک تو جذبۂ غیر محسوس شکل میں ہوتا ہے مگر اس کا نتیجہ محسوس ہوتا ہے۔ یہ چیز اپنے اندر زیادہ کشش رکھتی ہے اور آدمی کو جلد اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

توصدرِ ذی احتشام! جب تک دنیا اور آخرت کو دو الگ دنیائیں سمجھا جاتا رہیگا، زندگی کی رنگینیوں کو قابلِ نفرت سمجھا جاتا رہیگا۔ بے معنی رسموں کے نام پر ثواب کمایا جاتا رہیگا، حصولِ کمالِ انسانیت مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دِل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

——— (باقی) ———

(۴)

ثریا عندلیب

طلوعِ اسلام کے اس قرآنی پلیٹ فارم سے کھلے عام محاسبۂ خویش کرتے ہوئے سال بہ سال ہماری آواز بلند ہوتی ہے اور گئے سالوں میں اس سلسلے میں ہم بہت کچھ کہہ سن چکے ہیں۔ اپنی ذات اور کائنات کا تجزیہ کرتے ہوئے اور ماضی کا جائزہ لیتے ہوئے ہم نے اپنے حال و مستقبل کی شادابی و سرفرازی، درخشانی و کامرانی کے لئے بڑے بڑے عہد و پیمان باندھے۔ زندگی کی راہوں میں حائل سنگہائے گراں کو تیشۂ انسانیت سے کاٹ دینے کے بلند بانگ دعوے کئے۔ ہم نے قرآن حکیم کے ازلی و ابدی پیغام کی روشنی میں دیکھتے ہوئے اہلِ دنیا کو یہ نوید دی کہ دنیا میں حیوانیت و شیطنت کی جو شبِ تار محیط ہے وہ جاری و ساری نہیں رہ سکتی۔ اسی کے بطن سے وہ صبحِ نو ضرور جنم لے گی جس کے روشن سورج کی جگمگاتی کرنیں اس ارض اللہ پر شجرِ انسانیت کو بار آور کرینگی کہ یہی مقصود و منتہائے حیات ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے عالمِ انسانیت کی سربلندی کی اتنی اہم ذمہ داری کو قبول کر لیا تھا۔ پھر میرے قرآنی ساتھیو! یہ کیا قیامت ہے کیا غضب ہے کہ ہم آج یہاں ٹوٹے دلوں، اجڑے ذہنوں جھکی گردنوں اور برستی آنکھوں کے ساتھ مرزا غالب کی زبان میں اس کربناک مایوس کن حقیقتِ سیاہ کا اعتراف کر رہے ہیں کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

جی ہاں! یہ ہماری ہی فغانِ بے چارگی ہے جو فضا کو دھواں دھواں کر رہی ہے۔ غالب خستہ کو تو اپنے غلامانہ ماحول سے مجبور اور افرادِ معاشرہ سے مایوس ہو کر ذاتی طور پر یہ ایک نتیجہ اخذ کرنا پڑتا تھا۔ مگر اس لئے تو نہیں کہ شاعر کا یہ قول ایک ایسی حقیقتِ تابندہ بن جاتا اور یوں دائمی حیثیت اختیار کر لیتا کہ جس کی بھیانک تصویر اس کے بعد سو برس گزر جانے پر بھی

آج کا آدمی پیش کر رہا ہے حالانکہ اس تمام عرصے میں قانونِ قدرت کے مطابق زندگی نے بیشتر ارتقائی منازل طے کیں اور کر رہی ہیں۔ زمانے نے بیسیوں کروٹیں بدلیں اور بدل رہا ہے۔ تب سے اب تک دنیا کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی۔ آدمی کے علم و فکر نے اسے زمین سے آسمان تک جا پہنچایا۔ اس کی سوچ اور جستجو نے سائنس، ٹیکنالوجی کو وہ ترقی دی کہ اب سمندر آدمی کے قدم لیتا ہے۔ پہاڑ اس کے آگے سر جھکاتا ہے، ہوا اس کو تعظیم دیتی ہے۔ اس نے زمین کی طنابیں کھینچ دی ہیں اور وہ آسمان پر کمندیں ڈال چکا ہے۔ آج کی دنیا آدمی کے حیرت ناک کارناموں کی دنیا ہے۔ فطرت کا کونسا گوشہ ہے جسے آدمی کی نظر نے چھان نہیں ڈالا۔ فلہٰذا یہ ایک صداقت مسلّمہ ہے کہ آج تمام کائنات میں آدمی کے علم اور ذہانت کا علم لہرا رہا ہے مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی آدمی کی اتنی بلندی و ارجمندی کے ساتھ ساتھ انسانیت یعنی کردار و سیرت کی طرف سے ایسی پستی و بدمستی کا موجود رہنا جس کو ہم چیلنج کرنے کی آج ہمت نہیں پا رہے کوئی بتا سکتا ہے کیا اس سے بڑھ کر بھی دنیائے انسانیت کا کوئی المیہ ہو سکتا ہے؟ ستم بالائے ستم یہ کہ ہم جو بظاہر نہ صرف اچھے خاصے انسان نظر آتے ہیں بلکہ الحمدللہ کہتے ہوئے ہمیں اپنے مسلمان ہونے کا بھی زعم ہے دنیا کے سامنے آدمیت کے انسان ہونے کا ثبوت دینے کی توفیق نہیں رکھتے۔ ہاں مگر توفیق رکھتے ہیں تو ایسے گھناؤنے اطوار کی، ایسے بہیمانہ تاریک اخلاق کی کہ دنیا کی تاریخ میں ان کی مثال نہیں ملتی۔

حاضرینِ گرامی قدر! کیا اس سنگین و تلخ ترین سچ کے ثبوت کے لئے اپنے گھر کے سوا کہیں اور جانے کی ضرورت ہے؟ اپنے وطن عزیز میں، اپنے پیارے پاکستان میں اپنے ہی ناپاک معاشرے کے ہاتھوں آزادی کے وقت سے سسکتا جان جو کیچڑ اچھالا ہے اور اچھل رہا ہے، جو ناروائیاں سرزد ہوتی رہیں اور ہو رہی ہیں، انسانیت ساز قدروں کو پامال کرتے ہوئے جس طرح کا انسانیت سوز کردار اختیار کیا گیا ہے، یوں تو اس کی سینکڑوں ہزاروں زندہ مثالیں قدم قدم پر دن رات ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں اور طرح طرح کی ایسی ذلیل و عجیب وارداتیں جنم لیتی رہتی ہیں کہ زبان کے لئے ان کا ترجمان بننا کچھ آسان نہیں۔ لیکن عزیزانِ من! آدمی کی انسانیت کشی کے تعلق سے جو سانحہ عظیم اپنی انتہا کی آخری حد تک پہنچا ہوا "ہاکس بے" کا ہم پر گزرا ہے، کیا اس کے بعد بھی اس موضوع پر کوئی اور مثال دینے کو باقی رہ جاتی ہے۔ اف! اف! یہ کس کی داستان ہے۔ انسان کی؟ مسلمان کی؟ اہلِ پاکستان کی؟! میں آپ کو بتاؤں کہ جب اس مذاکرے کے لئے میں نے اپنے تاثرات قلمبند کرنے شروع کئے تو اگرچہ آدمی کی درماندگی و شکستہ حالی کی چھوٹی بڑی بے شمار مثالیں نگاہوں کے سامنے تھیں مگر میں کیا جانتی تھی کہ اس اہم موضوع پر قلم اٹھانے کے بعد ایسی ذلیل ترین واردات آدمی کی درندگی کی رونما ہوگی کہ جس نے دامنِ انسانیت کی دھجیاں ہی اڑا دیں گی۔ آپ سب جانتے ہیں کہ یہ ایسا شرمناک اور ذلت آمیز واقعہ ہوا ہے کہ جس کا ذکر تو کجا اس کے متعلق سوچتے ہوئے بھی قلبِ حساس پھٹنے لگتا ہے، ٹھنڈے پسینے آنے لگتے ہیں اور سانس رکتی محسوس ہوتی ہے۔ آپ ہی کہئے، آدم زاد کی ہستی کا ایسا کریہہ منظر اس خطۂ زمین کے سوا کہیں اور کبھی ماضی میں بھی نظر آیا؟ — یوں لگتا ہے جیسے اخلاق، شرم، حیا، شرافت، نجابت کا ہمارے ہاں کوئی دخل نہیں۔ ہمارے لئے گویا یہ بے معنی الفاظ ہیں اور جن اوصاف کی یہ نشاندہی کرتے اور آدمی کو انسان بناتے ہیں ہماری اجتماعی زندگی ان سے قطعی محروم ہو چکی ہے۔ اس کا جیتا جاگتا ثبوت تو ان انسان نما بھیڑیوں نے دے دیا جو قوم کے بیٹے اور طالب علم کہلاتے تھے جنہوں نے قوم کی بیٹیوں اپنی بہنوں کے ساتھ وہ انسانیت سوز سلوک کیا کہ حیوانیت و شیطنت بھی سرنگوں ہو گئیں۔ قرآن کریم نے ایسے ہی آدمی کے لئے کہا ہے کہ جب وہ انسان نہیں بنتا یعنی انسانیت کے صراطِ مستقیم پر نہیں چلتا تو وہ حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے

بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ اور یوں احسن تقویم ہونے کے باوجود اسفل السافلین کے قعرِ مذلت میں جا گرتا ہے۔ یوں تذلیلِ انسانیت کرنے والے یہ آدمی خدا کے نزدیک سب سے بڑے مجرم ہیں خواہ انفرادی طور پر اس جرمِ عظیم کے مرتکب ہوں یا اجتماعی صورت میں۔ نتیجہ اس کا معاشرے کی تباہی و بربادی کے سوا دوسرا ہو نہیں سکتا۔ اسی سے آج ہم دوچار ہیں۔ گویا عملی شکل میں یہ دلیل دے رہے ہیں کہ ـــــ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔

کہنے کو ہم مسلمان ہیں کیونکہ ہماری پیدائش مسلمان گھرانوں میں ہوئی اور ہمارے نام مسلمانوں جیسے ہیں۔ مسلمانی کے ان خود ساختہ لیبلوں سے ہی ہم نے اپنے آپ کو فریب دے رکھا ہے اور اسی خود فریبی میں مدہوش رہتے ہوئے ہم نے مقامِ انسانیت بھی کھو دیا ہے۔ مسلمان تو کیا ہونگے؟ جس گمراہ معاشرے کے مردوں کی یہ حالت ہو جائے کہ وہ عورتوں کو تحفظ کی ضمانت نہ دے سکیں، جو اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزت نہ کر سکیں۔ جو مردِ عصمت جیسی عظیم قدر کی حفاظت کرنا چھوڑ دیں کیا انہیں انسان کہا جا سکتا ہے؟ اور کیا ان سے تعمیرِ انسانیت کی ذرہ بھر بھی توقع کی جا سکتی ہے؟ حقیقت یہی ہے کہ ہمارے معاشرے کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

کس قدر تاسف انگیز اور دردناک بات ہے یہ کہ وہ آدمی جو ایک طرف زمین و آسمان کو مسخر کرتا نظر آئے دوسری طرف انسان بننے کی صلاحیت سے عاری ہو جبکہ اس کو پیدا کرنے والی ذمہ دار ہستی نے اسے زندگی کا وجود ہی اس لئے عطا کیا ہو کہ وہ ایک باشعور انسان بنے اور اپنی سوچ سمجھ کی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر جو اُسے خدا کی طرف سے ودیعت ہوئی ہیں، انسانی معاشرے کی بھلائی اور بہبودی، شادابی و سرفرازی کے لئے ہر دم کوشاں رہے، تاکہ یہ دنیا جنت نشان بن جائے۔ اس موقع پر زندگی کے اس اہم ترین مسئلہ پر توجہ دیتے ہوئے ہمارے لئے وہ مقامِ انسانیت پیشِ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے جس کا تعین خدائے علیم و رحیم نے اپنی آخری کتاب عظیم قرآن حکیم کی آیاتِ بیّنات میں واضح طور پر کر دیا ہے کہ یہی وہ منزلِ مقصود ہے جس کی طرف لے جانے والی سیدھی راہ سے آدمی بالفاظِ دیگر ہم بالکل ہٹ چکے ہیں۔ اور انسانیت سے ہماری اسی دوری نے اس جنتِ ارضی کو جہنم زار میں تبدیل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ـــ

وَ الْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ زمانہ یعنی تاریخِ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان جو وحی کی روشنی کے بغیر چلتا ہے وہ ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے۔ اس کی ہر محنت اکارت جاتی ہے، وہ ہر مقام پر خاسر و نامراد ہوتا ہے اور اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مگر انسانیت تو یہ ہے کہ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ یعنی کامیاب و کامران تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو خدا کی طرف سے عطا کردہ مستقل و مکمل اقدارِ حیات اور غیر متبدل اصولِ زندگی کی محکمیت پر یقین رکھتے ہیں لیکن صرف یقین ہی نہیں رکھتے۔ کیونکہ ذہنی طور پر محض یقین رکھنا تو کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتا۔ ان پر یقین رکھتے ہیں اور پھر انکے مطابق ایسے کام کرتے ہیں جو انسانوں کے الجھے ہوئے معاملات کو سنوار دیں اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا کر دیں جس سے تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے لیکن یہ کام انفرادی طور پر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اجتماعی طور پر ہی سرانجام پا سکتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ جماعتی زندگی بسر کرتے ہیں جس میں ہر فرد اپنا فریضہ اتنا ہی نہیں سمجھتا کہ جو کام اس کے ذمہ لگا دیا گیا تھا وہ اس نے پورا کر دیا وہ اپنے ساتھیوں سے بھی کہتا ہے کہ وہ اپنا حق ادا کریں اور جس قدر مشکلات ان کے راستے میں آئیں۔ ان کا مقابلہ ثبات و استقامت سے ساتھ کریں۔ ان کی ایک دوسرے کو حق اور استقامت کی تلقین خود ان میں باہمی ربط و ضبط کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

وہ ایسا مثالی معاشرہ استوار کرتے ہیں کہ جس میں ہر فرد دوسرے کی نشوونما کی فکر کرتا اور اسی میں اپنا مفاد اور خیر سمجھتا ہے وہ مسلسل اور متواتر اس روش پر گامزن رہتے ہیں اور اس طرح آنے والی نسلوں کے لئے زمانہ کی ریگِ رواں پر اپنے نقوشِ قدم ثبت کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ہے وہ مقامِ انسانیت جو ان دو مختصر مگر جامع ترین آیات میں واضح کر کے اختیار و ارادے کے حامل آدمی کی تقدیر بنا یا گیا ہے اور اس کی مزید تشریح قرآن میں جگہ جگہ ملتی ہے اور یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسانی زندگی کی تکمیل کا راز اور آدمیت کا معراج اپنی ذات سے ماورا مقاصد کے حصول میں پوشیدہ ہوتا ہے اور افرادِ معاشرہ باہمی تعاون و تناصر اور ضبط و ایثار سے ہی مقامِ انسانیت برقرار رکھ سکتے ہیں۔ قرآن اسے احسان کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ درحقیقت ہمارے پاس اپنے اعمال کی اچھائی اور برائی کو پرکھنے اور شرفِ انسانیت کو سمجھنے کے لئے ایک ہی محفوظ کسوٹی ہے اور وہ ہے قرآن حکیم۔ نزولِ قرآن سے منشائے ایزدی یہی تھا کہ دنیا میں جتنے بھی انسانیت کش مسالک چلے آ رہے تھے ان میں سے ایک ایک کی جڑ کٹ جائے اور آئندہ کے لئے ان کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ خدا نے خبیر و بصیر فرمایا ہے۔ الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔ یعنی یہ ضابطہ قوانین ہم نے تیری طرف اس لئے نازل کیا ہے کہ تو اس کے ذریعے نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے اور انکے نشوونما دینے والے کے قانون کے مطابق انہیں اس خدا کے بتجویز کردہ راستے پر ڈال دے جو جلال و جمال اور حسن و قوت کا مالک ہے۔ چنانچہ اسی راستے پر چلنے والی جماعت انسانی کامیابی و کامرانی کی زندگی بسر کرتی ہے اور دوسرے تمام انسانوں یعنی آدمیوں کی زندگی ناکامیوں اور نامرادیوں کی حسرت انگیز داستانوں کے سوا کچھ نہیں۔ یہی قانونِ خداوندی کل تھا یہی آج ہے اور یہی کل ہوگا۔ قرآن کریم کا حقیقی مقصد انسان کی سیرت و کردار میں خوشگوار تبدیلی پیدا کرنا ہے اور یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جب تک قرآنی فکر انسان کے قلب کی گہرائیوں تک نہ اترے۔ قرآن کے نزدیک جو آدمی انسانیت کے خصوصی اقدار کو اپنی زندگی کا محور و مقصود بناتا ہے وہی کامیاب انسان ہے۔ قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ ایمان و اعمالِ صالح سے کنارہ کش ہو کر زندگی بسر کرنے والے انسان سراسر خسران میں ہیں۔ درحقیقت خدا کی صفاتِ عالیہ انسانی زندگی کا نصب العین ہیں جس آدمی نے بھی ان صفات کو اپنانے کی سعی کی اسی نے انسانیت کی زندگی بسر کی۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ انسانی ذات کے مضمرات دوسروں کے ساتھ تعلقات اور معاملات کے وقت ہی مشہود ہوتے ہیں اور انسان اپنے آپ کو صرف اسی صورت میں پا سکتا ہے اس معیارِ حقیقی کے تحت اپنا محاسبہ کریں تو کاروبارِ زندگی کے ہر شعبے میں ہم نام نہاد انسانوں کا کردار نامستر و اقدار نظر آتا ہے۔ خود غرضی، مطلب پرستی اور محض مفادِ عاجلہ کے جذبہ شیطانی کے ہاتھوں ہمارا ہر آج گزرے ہوئے کل سے زیادہ بدتر بنتا جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال میں میرے محترم بہن بھائیو! کیا یہ وہ لمحۂ فکریہ نہیں ہمارے سوچنے اور سمجھنے کے لئے کہ ہم نے اور ہماری نئی نسل نے جو گزشتہ ربع صدی یعنی پچیس سال کے عرصے میں تیار ہوئی ہے انسان بننے کی ذمہ داری کو کس حد تک پورا کیا ہے اور اس کے لئے خدائے عزوجل کی عطا کردہ رہنمائی قرآن پاک کی تحکیم و مثبت تعلیم سے کیا فائدہ اٹھایا ہے۔ اصلیت اور سچائی تو یہ ہے کہ ہم نے قطع نظر ماضی کے اس تمام عرصے میں خدا کے قانون سے منہ موڑ کر جنگل کا قانون اختیار کئے رکھا اور یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ چنانچہ اب ہماری زندگی کا ہر ہر پہلو حیوانیت سے ملوث ہو چکا ہے۔ ہمیں آدمی کا نام تو اولادِ آدم کی نسبت سے

سے ملا تھا۔ اس کے بعد حلقۂ انسانیت میں داخل ہونے کے لئے حسنِ عمل، حسنِ کردار اور حسنِ اخلاق کی ضرورت تھی جس سے ہم تہی دامن رہے۔ اس کا انجام جو ہو سکتا تھا وہی ہوا۔ کسی دانشمند نے کہا تھا کہ جاہل آدمی کبھی اچھا انسان نہیں بن سکتا۔ اس کے برعکس ہم نے یہ ثابت کر دکھایا کہ تعلیم یافتہ انسان بھی اچھا انسان نہیں بن سکتا۔ اس کی گواہی کا کس لیے کے سالوں سے لیجئے جہاں ان پڑھے لکھے نوجوانوں نے جنہیں کل اپنی قوم کا معمار بننا تھا، اپنے چلن سے انسانیت ہی کا گلا گھونٹ ڈالا۔ انسان انسانیت کا شکاری ہو جائے۔ ہیہات — ہیہات!

سامعین کرام! میں گنانے کو تو اپنے معاشرہ کے وہ سینکڑوں عیوب گنا سکتی ہوں جو وجۂ ننگِ انسانیت ہیں۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس الم انگیز و محشر خیز حادثہ کے بعد اور عیب گنانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جب یہ کہہ دیا جائے کہ فلاں آدمی مر گیا ہے تو اس کے بعد اس کی بیماریوں کی تفصیل بیان کرنا بیکار ہو جاتا ہے۔ یہ واقعہ ہماری شرم کی موت ہے، حیا کی موت ہے۔ قوم کی موت ہے۔ اور قوم کی موت کی اس سے بڑھ کر زندہ شہادت اور کونسی ہوگی کہ اس حادثہ کبریٰ کا چرچا دو ایک دن تک تو رہا اور اس کے بعد پھر ہر طرف قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی۔ اقبالؒ نے اس قوم کا ماتم کرتے ہوئے کہا تھا۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

احساسِ زیاں کا جاتے رہنا درحقیقت وہ موت ہے جسے کوئی حشر بھی زندگی میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ حیاتِ جاوید کی مدعی قوم کی یہ مرگِ دوام! آسمان کی آنکھ نے ایسا حادثہ شاید ہی کبھی دیکھا ہو!

———(○)———

(۵)

شاہد امین حیدر

جناب صدر صاحبہ اور معزز شرکاء کنونشن!

جب ہم نوجوانوں نے مل کر اس مذاکرے کے لئے موضوع کا انتخاب کیا تو آدمی کو انسان بنا دینا کافی آسان دکھائی دیتا تھا۔ مگر جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو کئی دشواریاں سامنے آئیں۔ اس مصرعہ میں آدمی اور انسان دو الگ الگ کردار یا طبقات ہیں۔ ان دونوں طبقات کو اگر شروع ہی میں ایک دوسرے سے متمیز نہ کیا گیا تو وہی حشر ہوگا جو آج اور بہت سی ایسی اصطلاحوں کا ہو رہا ہے۔ ہمارے عام استعمال میں "انسان" اور "آدمی" کو ہم معنی الفاظ سمجھا جاتا ہے۔ لہذا بہتر ہوگا کہ پہلے میں کم از کم اپنے اس مضمون کے لئے ان اصطلاحوں کا مفہوم متعین کر لوں!

میرے خیال میں اس مصرعہ میں لفظ "آدمی" جانور کے مقابلے میں استعمال کرنا مناسب ہوگا۔ اس لحاظ سے آدمی وہ ہوگا جو جانور کی ایک ارتقا یافتہ شکل ہے۔ ان دونوں کا ارتقاء ایک مشترک مقام سے شروع ہوا۔ طبیعی خواص میں آدمی بالکل جانور جیسا ہے اور کیمیائی طور پر بھی ایسا ہی ہے۔ جانوروں پر آدمی کی برتری صرف ایک بنیادی خصوصیت کی بنا پر ہے۔ اور یہ خصوصیت عقل ہے عقل — جس کی بنا پر وہ علم حاصل کر سکتا ہے۔ عقل — جو اُسے قوتِ اختیار و ارادہ عطا کرتی ہے۔ جانوروں کی ایک متعین فطرت ہے جس پر وہ مجبوراً عمل پیرا ہیں مگر عقل کی وجہ سے آدمی کو اپنے لئے پسند و ناپسند کا اختیار حاصل ہے۔ عقل ہی آدمی کی فضیلت ہے۔ اگر عقل کو سلب کر لیا جائے تو آدمی اور جانور میں کوئی بھی

وجہ امتیاز باقی نہیں رہتی۔ ہمارا موضوع ہے۔

آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا!

آدمی کی خصوصیت تو ہم نے متعین کر لی۔ ہمارے اس موضوع سے ظاہر ہوتا ہے کہ "انسان" آدمی سے کچھ بلند شے ہے۔ لیکن جب تک وہ اپنی عقلِ بیباک تک محدود رہیگا وہ آدمی رہیگا۔ کیونکہ عقل ہی امتیازِ آدمیت ہے اور عقل میں ایک خامی یہ بھی ہے ذاتی مفاد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ لہٰذا "انسان" کو "آدمی" سے متمیز کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کی عقلِ بے باک کے ساتھ کوئی ایسی شے شامل کی جائے جو عقل کو اجتماعی مفاد کا تحفظ سکھاتی ہو۔

یہ تو تھا اصطلاحوں کا تعین۔ اب آیئے اصل موضوع کی طرف۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس مخلوق نے کئی مرتبہ آدمی بننے کی کوشش کی مگر ہر بار یہ آدمی بن کر پھر سے جانور بنتی رہی۔ کئی مرتبہ تو یہ مخلوق آدمی سے انسان تک بنی مگر افسوس کہ کچھ ہی عرصہ بعد یہ پھر سے جانور کی سطح پر آگئی۔ تاریخ میں اس جانور کے انسان بننے کا پہلا موقع اس وقت آیا جب اس کے سامنے ایک ایسی شے پیش کی گئی جو عقل کے عام تجرباتی طریق سے حاصل نہیں کی گئی تھی۔ یہ حضرت نوحؑ کا زمانہ تھا۔ ان افراد نے اس خاص چیز — یعنی وحیٔ الٰہی — کو تسلیم کیا وہ زمین کی عمیق پستیوں سے ابھر کر کائنات کے روشن ستارے بن گئے۔ اس کے بھی کئی مرتبہ ایسے مواقع آئے۔ حضرت ابراہیمؑ، شعیبؑ، یعقوبؑ، عیسیٰؑ، موسیٰؑ کے زمانہ میں بھی اہالیانِ ارض کا ایک گروہ بامِ عروج تک پہنچا۔ پھر کچھ صدیوں کی تاریکی کے بعد آخری مرتبہ آدمی کے معراجِ انسانیت تک پہنچنے کا واقعہ آج سے قریب ڈیڑھ ہزار سال قبل پیش آیا۔

لیکن انسانیت کی بدقسمتی دیکھئے کہ ہر موقع پر اس انسان کے ہی کچھ ساتھیوں نے اسے اس طرح پیچھے دھکیلا کہ وہ آدمی کے درجے کو بھی پیچھے چھوڑتا ہوا پھر سے جانور کی سطح پر پہنچ گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ ایک طویل موضوع ہے۔ لیکن اتنا تو صاف ظاہر ہے کہ اس مخلوق کے انسان بننے سے ایک طبقہ کے مخصوص مفادات شدید خطرے میں پڑ گئے تھے۔ یہ طبقہ سرمایہ داری، جاگیر داری اور سب سے بڑھ کر مذہبی پیشوائیت کی ملی بھگت پر مشتمل تھا۔ تاریخ میں جب کبھی آدمی انسان بنا اس طبقہ نے ایک ہی ردِ عمل ظاہر کیا۔ سب سے پہلے اس طبقہ نے دین کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی اور خدا اور اس کے درمیان حائل ہو گیا۔ اس کے بعد اس گروہ نے اپنے اقوال کو خدائی اقوال کہہ کر لوگوں کے سامنے پیش کیا اور سرمایہ داری، جاگیر داری اور ملوکیت کی نگہبانی شروع کر دی۔ خطرہ یہ تھا کہ ان کی سازش پکڑی نہ جائے۔ لہٰذا انہوں نے مسلسل پراپیگنڈہ کے ذریعے عقل کے چراغ بجھانے شروع کر دیئے۔ مذہب میں عقلی استدلال کا دروازہ بالکل بند کر دیا گیا۔ مذہب کو امورِ مملکت سے الگ کر کے شخصی قوانین کے متعلق احکامات اس طبقہ کی طرف سے جاری ہونے لگے۔ یوں اٹھو۔ یوں کھاؤ۔ یوں بیٹھو۔ یوں بولو۔ یوں سوؤ۔ یوں جاگو۔ غرضیکہ زندگی کے ہر چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ پر عوام الناس کو اپنا پابند کر لیا گیا۔ حتیٰ کہ اہالیانِ حکومت کو بھی ان کے احکامات کا پابند کر دیا گیا اور عملاً امتِ مسلمہ ایک تھیوکریٹک سٹیٹ بن گئی۔ قرآن کریم کے الفاظ کو کسی طرح تبدیل نہ کیا جا سکا تو تاویل سے قرآن کو پابند بنا دیا گیا۔ قرآن کے ساتھ مثلہٗ معہٗ اور کتابیں شامل کر دی گئیں اور حد تو یہ کہ ان انسانی اقوال کو خود قرآن کریم سے زیادہ اہم قرار دے دیا گیا۔ اسی قسم کے اور بہت سے حربوں کے ذریعے اور بہت سے نئے نئے عقاید وضع کر کے دینِ خداوندی میں اضافے اور تبدیلیاں کرنے کی کوشش کی گئی اور اس طرح دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ علم و ہنر، جسم و جان اور روح و دماغ

پر اجارہ داری قائم کر دی گئی۔ اس طرح چراغِ دین کو تہ بہ تہ پردوں کے نیچے چھپا دیا گیا۔ یہ گروہ مذہب کا کاملاً اجارہ دار بن گیا اور انسان — انسان عقل سے محروم اور بیشۂ تحقیق سے تہی ہو کر صوفی و ملا کا غلام بن کر رہ گیا اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ عقل سے محروم ہونے کے بعد اور کوئی شے ایسی نہ تھی جو اسے جانور سے متمیز کر سکے۔

تیرہ سو سال میں عقل کا یہ جمود آہستہ آہستہ ٹوٹا تو افراد اور اقوام نے پھر جانور کی سطح سے بلند ہونا شروع کیا۔ وحیٔ الٰہی کے عمل میں خصوصیت یہ تھی کہ یہ مخلوق آدمی کی منزل سے گزر کر بہت جلد انسان بن جاتی تھی مگر اب اس مخلوق کا آدمی کی منزل سے گزر جانا کارے دارد تھا۔ عقل نے آنکھ کھولی تو وحی کے سورج کو ملائیت کے پردوں تلے چھپایا جا چکا تھا۔ آخر عقل نے اندھیروں میں بھٹکتے آگے بڑھنا شروع کیا۔ اس طرح آدمی نے اپنے مخصوص تجرباتی طریق سے طبعی کائنات کا علم حاصل کرنا شروع کیا۔ سائنس کے ذریعے آدمی نے کائناتی قوتوں کو مسخر کیا اور اپنی سوسائٹی کی ظاہری شکل و صورت میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس کے بعد اس کے فضا کی پہنائیوں تک قدم بڑھا دیئے مگر افسوس کہ ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

تدبر کی جدید ترین فسوں کاری سوشلزم یا کمیونزم کی شکل میں سامنے آئی۔ اس عقلِ جدید کے مطابق آدمی کا عظیم ترین مسئلہ روٹی کا مسئلہ ٹھہرا اور روٹی حاصل کرنے کے بعد آدمی اس طرح مطمئن ہو گیا جیسے اس نے سب کچھ حاصل کر لیا ہو۔ معاشی مسئلہ کا حل نہایت ضروری ہے اور یہ مملکت کے فرائض میں شامل ہے۔ مگر روٹی کی حیثیت زادِ راہ کی ہے۔ سوشلزم نے اس زادِ راہ کو ہی منزلِ مقصود سمجھ لیا۔ آدمیت کا منتہا ایک ایسی سٹیٹ ٹھہری جس میں ہر فرد کو دو وقت کی روٹی میسر آ سکے۔ اس حالت میں عقل کے استعمال کی وجہ سے اسے آدمی کہا جا سکتا ہے لیکن روٹی کو مسئلہ اعظم سمجھنے پر اسے جانور بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ اسے جو بھی کہیئے لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ بہرحال آدمی کو انسان ہونا تو ابھی تک میسر نہیں آیا۔

یہاں تک پہنچنے پر کچھ لوگوں کے دل میں خیال پیدا ہو گا کہ ہم بھی باقی دنیا کے ساتھ کم از کم آدمی کی سطح پر تو ضرور ہیں۔ جی نہیں! جانور کے مقابلے میں آدمی کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی عقل کا استعمال کرتا ہے جبکہ ہمارے مذہب گزیدہ معاشرہ میں تو ابھی تک عقلی استدلال ایک ابلیسی فعل ہے۔ ہمارے ترقی پسند ارباب اختیار ابھی تک لاکھوں روپے نذرانہ گزارتے ہیں اور ہمارے مقدس راہنما افراد کی پیاس بجھانے کے بجائے قبروں کو عرقِ گلاب سے نہلاتے ہیں۔ یہی ہیں وہ غلط عقاید جن کی وجہ سے ہمارے معاشرہ میں سے سوچ کا عنصر بالکل غائب ہو گیا۔ راہنماؤں کی اندھی تقلید رواج پا گئی اور ہم نے کبھی اپنے کسی راہبر کو ٹوکنے کی کوشش نہ کی۔ اگر ہم اپنے راہنماؤں کو اپنے سامنے جواب دہ بناتے تو آج ہماری قوم جہنم کے اس گھیرے میں نہ آتی۔ ہماری عقلوں کو اس طرح ماؤف کیا گیا ہے کہ آج ہماری اس قوم کو تباہی کے اس گڑھے سے نکلنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی اور ہم مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔

راہ موجود ہے لیکن راہ نظر کس طرح آئے جبکہ ہماری آنکھوں کی روشنی چھین لی گئی ہے۔ جب تک ہم اپنی عقل پر پڑی ہوئی ہماری زنجیروں کو پاش پاش نہ کریں، ہم یہ راہ نہیں دیکھ سکتے۔ جب تک ہم مذہبی اجارہ داری کو ختم نہ

کریں۔ حقیقت کو گرفت میں لا نہیں سکتے۔ راہ موجود ہے مگر راہ کو دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ عقل کو آزاد کیا جائے۔ تاکہ سائنس کے ذریعے فطرت کی قوتوں کو غلام کیا جا سکے۔ مذہبی اجارہ داری کو ختم کیا جائے تاکہ آدمیت مستقل اقدار کی شمعوں سے راہِ فلاح کو منور کر سکے۔

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی

(۰)

(۶)

شاہدہ منظور

آج کا موضوع ہم سے کہہ رہا ہے کہ ب۔ آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا ۔ یعنی آدمی باوجود آدمی ہونے کے اخلاق حسنہ (جو معیار انسانیت ہیں) کی نمود میں کوتاہ دست ہے۔ اس حقیقت کو ایسے سادہ لفظوں میں غالب کے سوا شاید ہی کوئی بیان کر سکا ہو۔

تاریخ انسانیت پر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ انسانیت کی ساری تاریخ خوں ریزیوں اور فساد انگیزیوں کا عبرتناک مرقع اور جگر خراش داستان ہے جس میں ایک فرد دوسرے فرد کے 'ایک خاندان دوسرے خاندان کے' ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے اور ایک قوم دوسری قوم کے سامنے خنجر بدست کھڑی ہے۔ اور یہ سب کا ہے کے لئے اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۔ تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے زیادہ سلب نہب کر سکے۔ اس طرح اس پر بالادست ہو جائے۔ قوموں کی اس باہمی کشمکش سے انسانیت اس جہنم سے گزر رہی ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر بین الاقوامی سطح پر آتے ہیں تو اس سطح پر اجمالی طور پر اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہوگا کہ جو کچھ بالادست طبقہ ایک زیردست طبقہ کے ساتھ ایک معاشرے کے اندر کرتا ہے وہی کچھ ایک بالادست قوم زیردست قوموں کیساتھ کرتی ہے۔ ہمارے زمانے میں بالادست قومیں صنعت میں ترقی یافتہ ہیں۔ اس لئے انہیں ایک طرف ایسی قوموں کی ضرورت ہوتی ہے جو انہیں خام مال سپلائی کریں۔ اور دوسری طرف اُن منڈیوں کی جہاں ان کا تیار کردہ مال فروخت ہو۔ اس مقصد کے لئے ان اقوام نے ان پسماندہ اقوام پر اپنا سیاسی تسلط براہ راست قائم کیا۔ اُن کے گھروں میں پہنچ کر چھاؤنیاں ڈال دیں اور ان پسماندہ اقوام کی عادات اس قدر بگاڑ دیں کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اُن کی محتاج ہو گئیں۔ اور تہذیب کی فریبکارانہ زبان میں یوں کہا جائے گا کہ انہوں نے ان کا معیارِ زیست بلند کر دیا۔ دوسری طرف انہیں اس قدر اپاہج بنا دیا کہ وہ اب وہ کچھ بھی اپنے ہاتھ سے تیار نہ کر سکیں جو کچھ وہ پہلے اپنے ہاتھوں سے تیار کر لیتی تھیں۔ اس حالت تک پہنچا کر وہ اپنے ملکوں کو واپس چلی گئیں۔ اور میکیاولی سیاست کی زبان میں کہا جائے گا کہ انہوں نے انہیں آزادی عطا کر دی۔ اور ان اقوام ہی پر نہیں عالم انسانیت پر ان کا احسانِ عظیم ہے۔ پھر انہیں اس طرح اسلحہ فراہم کرتی ہیں کہ کبھی ایک کا پلڑہ جھک جائے کبھی دوسری کا۔ اس طرح اِن اقوام کی آمدنی کا بیشتر حصہ اسلحہ کی خرید کی نذر ہو جاتا ہے اور انہیں روٹی تک بھی مانگ کر کھانی پڑتی ہے۔ فسادِ آدمیت کے لئے یہ حربے کچھ کم نہیں ہیں۔ اس کا نتیجہ وہ جہنم ہوتا ہے جس میں انسانیت کا ہر شرف جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔

یہ ہے عزیز سامعین! وہ مقام جس پر انسانیت اس وقت کھڑی ہے۔ اس سے یہ کرۂ ارض انسانوں کی بستی نہیں رہا، ایک ایسا مذبح بن چکا ہے جس میں جسدِ انسانیت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھرا پڑا ہے اور وہی نوعِ انسان جو کبھی ایک برادری تھی۔ اس کی کیفیت یہ ہے ؎

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

وہ ملتِ اسلامیہ جسے قیامت تک تمام انسانیت کی بھلائی اور منتشر نوعِ انسان کو متحد کرنے کے لئے منتخب کیا گیا۔ آج اس کا اپنا شیرازہ ابتر ہو چکا ہے۔ صورت اس وقت یہ ہے کہ ایمان کے اشتراک سے اُمت کی تشکیل تو ایک طرف ہم دنیا کی عام اقوام کی طرح وطن کے اشتراک سے بھی ایک قوم نہیں بن سکے۔ یہاں بنگالی بستے ہیں، بلوچی بستے ہیں، سندھی بستے ہیں، پنجابی بستے ہیں۔ پختون بستے ہیں اور تعصب کا یہ عالم ہے کہ ایک بنگالی مسلمان کے نزدیک غیر بنگالی مسلمان کے مقابلہ میں بنگالی ہندو زیادہ عزیز ہے۔ یہی کیفیت دوسری جگہ بھی پائی جاتی ہے۔ سیاسی افتراق کا یہ عالم ہے کہ تقسیم سے پہلے اصولی طور پر مسلمانوں کی دو سیاسی پارٹیاں تھیں۔ ایک مسلم لیگ جو مطالبۂ پاکستان کی محرک و مؤید تھی اور دوسری متحدہ قومیت کے حامیوں کی۔ لیکن اب ہماری حالت یہ ہے کہ جو اینٹ اٹھائیں "ایک نئی سیاسی پارٹی" ابھر کر سامنے آجائے گی۔ ایسا نظر آتا ہے یہ ملک انسانوں کی بستی نہیں درندوں کا جنگل ہے۔ کیا ہم نے زمین کا یہ ٹکڑا اس لئے حاصل کیا تھا کہ اُسے انسانوں کا مامن بنانے کے بجائے درندوں کا مسکن بنا دیں جس میں یہ گروہ دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا ہے اور یہ جماعت دوسری جماعت کی جان کی لاگو ہے اور جس کا خمیازہ ہم نے اس بری طرح بھگتا ہے کہ ؎ قفس کے سامنے جلتا تھا آشیاں اپنا۔
اس آشیاں سوزی کا منظر ہم سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور دیکھ بھی رہے ہیں۔ جن کی تفاصیل اس قدر درد انگیز، جگر سوز، دلدوز اور المناک ہی نہیں بلکہ شرمناک بھی ہیں کہ ان کا تصور کرتے ہی کلیجہ سے ہوک اٹھتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کسی قوم پر جو مظالم پیش کئے وہ اسکے دشمنوں کی طرف سے روا رکھے گئے۔ لیکن یہاں جو کچھ ہوا خود انہوں نے اپنوں کے ساتھ کیا۔

یہاں اہلِ چمن نے اپنے ہاتھوں سے آشیانوں کو نذرِ آتش کر دیا۔ یہاں گھر والوں نے قزاقوں کو دعوت دیکر بلایا۔ یہاں مسلمان نے مسلمان کا خون پیا۔ یہاں دوستوں نے دوستوں کے کلیجے چبائے۔ یہاں بھائیوں نے بھائیوں کی گردنوں پر برچھیاں چلائیں۔ یہاں بھائیوں نے بہنوں کی عصمتیں لوٹیں۔ یہاں باپوں نے بیٹیوں کو درندوں کے حوالے کر دیا اور جوشِ انتقام میں اُن حربوں پر اتر آئے جو فی الحقیقت باعثِ ننگِ انسانیت تھے۔ انہوں نے ایسے ایسے مظالم کئے ہیں جہاں درندوں کے دل بھی پگھل جائیں۔ لوہا بھی آنچ میں گداز ہو جاتا ہے لیکن ان کے پتھر دل ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ؎

اے محمدؐ! اگر قیامت را برآری سر زخاک
سر برآور وایں قیامت درمیانِ خلق بیں

پھر ہمارے جیالے فوجی جن پر قید میں بھی گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ وہ ہزارہا غیر بنگالی گھرانے جو وہاں آباد ہیں۔ انکے ساتھ وہ مکتی باہنی جس کی انتقام جوئی درندوں کو بھی مات کر گئی۔ لیکن انسانیت کس قدر بے بسی دیکھئے کہ کوئی ان سفاکیوں اور ہولناکیوں کو روک نہیں سکتا۔ چاہے جس زاویہ نگاہ سے دیکھیں کہیں کوئی انسانیت کا شائبہ تک نظر آتا ہے۔ یہ

انسانیت کی چیخیں ہیں جو انتہائی بے بسی کے عالم میں موجودہ معاشرہ کی پتھریلی فضا کو چیر کر آسمان کی طرف جانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ کیا ان حالات میں انسان اپنے آپ کو صفِ انسانیت میں کھڑے ہونے کے قابل سمجھ سکتا ہے؟ کس قدر دُکھ کی بات ہے کہ آدمی ہونے پر آدمیت سے محروم ہے اور انسان ہونے پر انسانیت سے محروم ہے۔

گزشتہ چند صدیوں میں سائنس کے ہر شعبہ میں بے اندازہ ترقی ہوئی ہے۔ جہاں اُس کے اکثر شعبے ایسے ہیں جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں وہاں چند شعبے ایسے بھی ہیں جن کی ترقی سے انسانیت کے لئے بڑے خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔ آن کی آن میں ہر ایک قوم دوسری قوم کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ انسان آج ستاروں کی دنیا سے آگے جانے کی فکر میں ہے لیکن انسانیت کے مسائل جوں کے توں پڑے ہیں۔ اس کا ماحول مادیت کے اعتبار سے دیکھئے رنگین ہے اور انسانیت کے لحاظ سے جس قدر ناچیز یہ اس دور کا انتہائی المیہ ہے کہ خارجی کائنات سے متعلق انسان کا علم انسانیت و اخلاقیات سے کہیں زیادہ ہے۔ اُس نے زمین و آسمان کے پردے چاک کئے اور مادیت کے راز افشا کر دیئے لیکن آج تک اس کا سراغ نہ لگا سکا کہ وہ خود کیا ہے۔ اپنے متعلق اُس کا علم آج بھی اتنا ہی قلیل ہے جتنا کہ زمانہ قدیم میں تھا۔ بقولِ اقبالؒ

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

کیا کوئی تحقیق انسانی ذات کی اپنی تحقیق سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس نے یہ سب کچھ دریافت کیا ہے۔ کیا ایک مجسمہ سنگ سنگتراش سے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے۔ کیا ایجادات موجد سے زیادہ لائق تحسین ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ پیشوایانِ مذاہب بھی انسان کے مرضِ دیرینہ کا علاج نہ کر سکے۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ عہدِ حاضر کے فلاسفر و سائنسدان بھی اس کا کچھ مداوا نہ کر سکے اور انسانی جدوجہد کی تاریخ کا ہر ورق اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا چلا گیا ——— مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی؛

مفکرینِ عہدِ حاضر آج سر بگریباں انسانی الجھنوں کی ان گتھیوں کو سلجھانے کی فکر میں ہیں۔ وہ اس کوشش میں جتنا آگے بڑھتے ہیں اُن کے قلوب و اذہان مزید گتھیوں میں اُلجھ جاتے ہیں۔ یہاں تک تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ آدم کی مصیبت کا علاج اخلاقیات میں ہے لیکن وہ اخلاقیات کی دنیا میں ابھی کچھ دور نہیں جانے پاتے کہ ان کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور وہ منزل کے راستوں ہی میں گم ہو جاتے ہیں۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی یہ حالت ابدی ہوگی۔ کیا وہ اس نفسا نفسی کی قیامت خیزی اور تشتت و انتشار کے جہنم سے کبھی نکل نہیں سکے گا۔ وہ ابدی طور پر راندۂ درگاہ ہو گیا ہے لیکن نہیں ——— نہیں ایسا نہیں ——— ابدی مایوسی شرفِ انسانیت کے منافی ہے۔ انسان پھر سے اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پا سکتا ہے۔ ہمارے درمیان وہ الحق موجود ہے جو زندگی کے بارے میں ایسا غیر مبہم، واضح اور دو ٹوک فیصلہ دیتا ہے۔ اس کے بعد ہماری دنیائے انسانیت کے لئے کسی قسم کے شکوک و شبہات اور ظن و توہمات کا تاریک زنداں باقی نہیں رہتا۔ یہی وہ روشنی کا مینار ہے جو طوفان میں گھری ہوئی کشتی انسانیت کو ساحلِ مراد کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ انسانیت کو یہ سربلندی و سرفرازی رسولِ اکرمؐ کے زمانہ میں حاصل ہوئی تھی اور اس قلیل عرصہ میں مسلمانوں کو وہ عزت و عظمت اور قوت و حشمت حاصل ہوئی کہ روئے زمین پر کسی دوسری قوت کو اُمتِ مسلمہ سے ٹکرانے

کا یارا نہ رہا۔

اگر پیدائشی صلاحیتیں عمر بھر اپنی سطح پر جامد رہتی ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی تو بلال حبشی، صہیب رومی، زید اور ان کے بیٹے اسامہ اور اُن جیسے سینکڑوں غلام مزدور جنہیں اُس زمانہ کے معاشرہ نے ہر قسم کی صلاحیتوں سے عاری اور ذلیل ترین مخلوق قرار دے رکھا تھا، چند دنوں کی صحیح تعلیم و تربیت سے کس طرح انسانی صلاحیتوں کے بلند ترین مظہر بن گئے۔ اسی صحیح تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں اسلامی فوجیں جس ملک میں جاتی تھیں لوگوں کو خواہ ان کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کیونکہ چند بادیہ نشینوں کا دنیا کی تسخیر کو اٹھنا حیرت و استعجاب سے خالی نہ تھا۔ جب لوگوں کو انہیں دیکھنے اور ملنے جلنے کا اتفاق ہوتا تو ایک ایک مجاہد سچائی، سادگی، پاکیزگی، جوش اور اخلاص کی تصویر نظر آتا۔ یہ چیزیں خود بخود لوگوں کے دلوں کو کھینچتی تھیں اور اسلام اُن کے دلوں میں گھر کر جاتا تھا۔

یہ درست ہے کہ ہماری نئی نسل کا ایک حصہ قناعت پسند ہو گیا ہے۔ وہ اندھیرے ہی میں رہنے کا خوگر ہو چکا ہے لیکن اس کے ساتھ ایک بڑا طبقہ اس صورت حال سے مطمئن نہیں۔ وہ انسانیت کو اُس کے مقامِ شرف و مجد سے ہمکنار کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس کا سراغ لگانا چاہتا ہے کہ

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند ؛ گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

اس طبقہ کی تڑپ اور خلش۔ ان کا سوز و گداز صرف ہمارے معاشرے ہی کے لئے نہیں۔ بلکہ پوری نوعِ انسانی کے لئے مرکزِ توجہ بن رہا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جو خدا کی کتاب مظیم کی شمع فروزاں کو لے کر اس لئے مصروفِ سفر ہے کہ اس سے انسانیت کی راہیں روشن ہو جائیں۔ اگر مفاد پرست گروہ اسے اپنی مخالفت سمجھتا ہے تو سمجھا کرے ہم اُن کی خاطر انسانیت کو تاریکیوں میں نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر چمگادڑ طلوعِ سحر سے پیچ و تاب کھاتا ہے تو اُس کی خاطر سورج شب کی رداؤں کے پیچھے چھپا نہیں رہ سکتا۔ یہ بے نقاب ہو کر رہے گا۔

(*)

⊙ پاکستان کی بنیاد کیا تھی ⊙ بانیٔ پاکستان، اقبالؒ اور معمارِ پاکستان قائد اعظمؒ نے اس مملکت کا تصور کیا دیا تھا ⊙ دو قومی نظریہ کیا ہے ⊙ نظریہ پاکستان نہ کبھی فیل ہوا ہے نہ کبھی فیل ہو سکتا ہے ⊙ پاکستان اب بھی ایک قابلِ فخر مملکت بن سکتا ہے

یہ موضوع ہے پرویز صاحب کی کتاب

قائد اعظمؒ کے تصور کا پاکستان

کا۔ جو ابھی ابھی شائع ہوئی ہے۔ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا ایک نسخہ ہر اس گھر میں رہے جس کے بچے تعلیم حاصل کر رہے ہوں یا کر چکے ہوں۔

قیمت - دس روپے -/۱۰ (علاوہ محصول ڈاک)

آپ اپنی کاپی جلد منگا لیجئے۔ ورنہ پہلا ایڈیشن ختم ہو جائے گا۔

ضخامت ۳۲۸ صفحات - بڑی تقطیع - سفید کاغذ

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور